عرض احوال

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بگلیہار ڈیم: جگ ہنسائی

آج کی تازہ خبر: ''پاکستان نے بگلیہار کے تنازعے پر عالمی بینک سے رجوع کرنے کے بعد عالمی عدالت انصاف جانے کی تیاریاں شروع کر دی ہیں۔ اس ضمن میں اٹارنی جنرل' وزارتِ خارجہ اور وزارتِ پانی وبجلی کی باہمی مشورت سے ملکی وغیر ملکی ماہرین قانون کی خدمات حاصل کی جائیں گی۔ یہ تنازعہ عالمی عدالت انصاف میں رجوع کرنے کے لئے کم از کم دس لاکھ ڈالر کی ضرورت ہوگی''۔ (روزنامہ نوائے وقت۔ 24 جنوری 2005ء)

یوں تو یہ تنازعہ پانچ سال سے' جب سے کہ بھارت نے مقبوضہ کشمیر میں دریائے چناب پر بگلیہار ڈیم بنانا شروع کیا ہے' جاری ہے اور معاملہ سلسلۂ خط وکتابت سے آگے نہ بڑھ سکا تھا' لیکن نومبر 2004ء میں یہ تنازعہ ''جامع مذاکرات'' کی میز پر آیا تو اصل حقیقت عوام کے سامنے آ گئی۔ تب پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف کے زیر صدارت ایک اعلیٰ سطحی اجلاس (18 نومبر) میں بھارت کو متنازعہ ڈیم کی تعمیر سے روکنے کیلئے تمام ممکنہ سفارتی اور قانونی طریقے استعمال کرنے پر اتفاق کیا گیا۔ جس پر ''ندائے خلافت'' کے شمارہ بابت 25 نومبر میں ادارتی اظہارِ خیال کیا گیا۔

پاک بھارت جامع مذاکرات شروع ہونے والے تھے کہ حکومت پاکستان نے مذاکراتی عمل کو ڈیم پر کام بند کرنے سے مشروط کر دیا۔ بھارت نے یہ شرط قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ حکومت پاکستان نے بھارتی طرزِ عمل سے عالمی برادری کو آگاہ کیا۔ جنوری کے پہلے ہفتے میں پاک بھارت سیکرٹری سطح کے ''غیر مشروط'' مذاکرات ہوئے' جو بے نتیجہ ثابت ہوئے' کیونکہ بھارت ڈیم کا ڈیزائن بدلنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اصل اختلاف ڈیم کی بلندی پر ہے۔ پاکستان کے مطابق یہ ڈیم منگلا ڈیم کے برابر ہے۔ بھارت کا کہنا ہے کہ بگلیہار ڈیم ریاست مقبوضہ کشمیر کا ہے۔ ریاستی حکومت نے اس منصوبے پر مالی اداروں سے سترہ ارب روپے بطور امداد حاصل کرنے کے لئے مفاہمت کی یادداشتوں پر دستخط کر رکھے ہیں' جبکہ اس منصوبے پر پہلے ہی سولہ ارب 40 کروڑ روپے خرچ ہو چکے ہیں' اور مزید 6 ارب 32 کروڑ عنقریب بھارتی حکومت ریاستی حکومت کو دینے والی ہے۔ ایسی صورت

حال میں ڈیزائن کی تبدیلی ناممکن ہے۔ گویا بھارت نے کہے بغیر پاکستان سے کہہ دیا کہ عالمی بینک جانا چاہتے ہو تو شوق سے جاؤ۔ ہمیں جو کچھ کرنا تھا' وہ ہم نے کر لیا ہے۔

مذاکرات کے ناکام ہونے کی خبر 7 جنوری کو آئی اور 9 جنوری کو ''آن لائن'' سے یہ خبر جاری ہوئی کہ بھارتی فوج کے اعلیٰ تربیت یافتہ خصوصی دستے بگلیہار ڈیم کی حفاظت کے لئے مقبوضہ کشمیر پہنچ گئے ہیں۔ بھارتی فوج نے مجاہدین کی جانب سے حملے کے پیش نظر اسرائیل اور امریکا سے تربیت یافتہ خصوصی فوجی دستوں کو بگلیہار ڈیم پر تعینات کر دیا ہے۔ خبر میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اسرائیل اور امریکا سے تربیت پانے والے بھارتی فوج کے کمانڈوز کو جموں کے فضائی اڈے کی مدد بھی حاصل ہے اور بھارتی فضائیہ کے طیاروں کا ایک پورا اسکوڈرن ڈیم کی حفاظت کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔

بھارت کی طرف سے ڈیم کی جلد از جلد تکمیل کے لئے تو اقتصادی اور فوجی تیاریوں کا یہ حال تھا' اُدھر حکومت پاکستان کی سست گامی کا یہ عالم کہ 20 جنوری کے اخبارات میں' اہل پاکستان نے' جبکہ وہ عیدالاضحیٰ کی تیاری کر رہے تھے' عالمی بینک کی طرف سے جاری کردہ یہ بیان افسوس اور غصے کے ساتھ پڑھا کہ ''عالمی بینک کو پاکستان کی طرف سے سندھ طاس معاہدے کے تحت ایک درخواست موصول ہوئی ہے جس میں ''غیر جانب دار ماہر'' مقرر کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔ عالمی بینک اس درخواست کا جائزہ لے گا اور معاہدے کے مقررہ ضابطہ کار پر عمل کرے گا۔ عالمی بینک سندھ طاس معاہدے کا ضامن ہے نہ ثالث ہے۔ البتہ غیر جانب دار ماہر کی تقرری کر سکتا ہے' جس کا فیصلہ حتمی ہوگا''۔

عالمی بینک کا یہ بیان جاری ہونے کے فوراً بعد 21 جنوری کو بھارت کے سرکاری ذرائع ابلاغ ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے تشہیر کی کہ بھارت پاکستان کے اعتراضات' احتجاج اور قانونی موشگافیوں کے باوجود بگلیہار ڈیم کی تعمیر مکمل کرے گا۔ یہ ڈیم سندھ طاس معاہدے کے عین مطابق ہے۔ ڈیم کی تعمیر بھارت کا حق ہے۔ اس سے پیدا ہونے والی بجلی مقبوضہ کشمیر میں استعمال کی جائے گی۔ پاکستان کے اعتراضات فنی نوعیت کے نہیں' بلکہ سیاسی ہیں۔

آج 24 جنوری کو خبر آئی ہے کہ پاکستان نے عالمی عدالت انصاف سے رجوع کرنے کی تیاریاں شروع کر دی ہیں۔ کیوں؟ عالمی بینک کا فیصلہ آنے سے پہلے ہی؟ کیا ہماری حکومت کو غیر جانب دار مبصر اور اُس کے حتمی فیصلے کی شرط سے سر ریڈ کلف یاد آ گیا؟ وہ بھی غیر جانب دار مبصر تھا۔ سوال یہ ہے کہ اگر عالمی بینک یا بعد ازاں عالمی عدالت کا فیصلہ بھارت کے خلاف ہوا تو کیا وہ ڈیم ڈھا دے گا یا تعمیر روک دے گا؟ پوری اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی

بقیہ: عرضِ احوال

کے خلاف ہوا تو کیا وہ ڈیم ڈھا دے گا یا تعمیر روک دے گا؟ پوری اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی اور سکیورٹی کونسل آج تک بھارت سے کشمیریوں کو حق خود ارادیت دلوا نہ سکی' کوئی چھوٹا عالمی ادارہ معمولی ڈیم کی تعمیر کیونکر رکوا سکتا ہے؟

اصل بات یہ ہے کہ ''ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات'' کے مطابق ہم جرمِ ضعیفی کی سزا بھگت رہے ہیں اور اقوامِ عالم میں اپنی اوٹ پٹانگ پالیسیوں کی وجہ سے جگ ہنسائی کا موجب بن رہے ہیں۔ مسلمانانِ پاکستان جب تک اپنے اجتماعی جرائم کا کفارہ ادا کرنے کی خاطر اجتماعی توبہ اور ملک میں دینِ حق کے قیام و نفاذ کی طرف سنجیدگی سے قدم نہیں بڑھائیں گے' کمزور و ناتواں رہیں گے اور امریکہ کے سامنے سجدہ ریز ہونے کے ساتھ ساتھ بزدل بھارتی بنیے کے سامنے بھی بے بسی و لاچاری کی تصویر بنے رہیں گے۔ اللہ کی مدد حاصل کیے بغیر ہماری حقیقت خس و خاشاک سے زیادہ نہیں۔ کاش ہم مسلمانانِ پاکستان اور ہمارے حکمران' یو این او' عالمی بینک اور عالمی عدالت انصاف سے توقعات وابستہ کرنے کی بجائے اللہ کا دامن تھامنے کا عزم مصمم کریں اور اس کے لئے عملی قدم اٹھائیں اگر ایسا ہو گیا تو عالمی شیطانی قوتیں ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گی۔

کیا ڈر ہے اگر ساری خدائی ہے مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے!

(باقی صفحہ 40 پر)

تذکرہ و تبصرہ

دَورۂ بھارت کے مشاہدات وتاثرات

بانی سیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ

مقام: قرآن آڈیٹوریم لاہور، بتاریخ: ۲ جنوری ۲۰۰۵ء

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رَسولہِ الکریم ..... امّا بَعد:

اعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرّجیم۔ بِسمِ اللّٰہِ الرّحمٰنِ الرّحِیمِ

﴿فَاِنۡ یَّکۡفُرۡ بِہَا ہٰۤؤُلَآءِ فَقَدۡ وَکَّلۡنَا بِہَا قَوۡمًا لَّیۡسُوۡا بِہَا بِکٰفِرِیۡنَ﴾ (الانعام)

﴿وَاِنۡ تَتَوَلَّوۡا یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ ۙ ثُمَّ لَا یَکُوۡنُوۡۤا اَمۡثَالَکُمۡ﴾ (محمد)

ادعیہ ماثورہ کے بعد:

آج مجھے اپنے حالیہ سفرِ بھارت کے مشاہدات اور تاثرات بیان کرنے ہیں۔ میرا یہ سفرِ بھارت تیرہ سال بعد ہوا اور یہ اس اعتبار سے منفرد ہے کہ اب تک میرے بھارت کے جتنے سفر بھی ہوئے اُن میں یہ طویل ترین تھا۔ اس سفر میں میرے ۳۳ دن صرف ہوئے۔

پس منظر کے طور پر میں چاہتا ہوں کہ اپنے سب سے پہلے سفر بھارت کا بھی تذکرہ کر دوں۔ ۱۹۴۷ء میں ہم نے پاکستان ہجرت کی اور حصار سے سلیمانکی ایک سو ستر میل کا فیصلہ بیس دن میں پیدل قافلے کے ساتھ طے کیا۔ اس کے بعد پورے ۳۳ برس تک واپس بھارت جانے کا کوئی امکان نہیں ہوا۔ پہلا سفر ۱۹۸۰ء میں ہوا جب ہم زمینی راستے سے گئے تھے۔ میرے ساتھ میرے ایک رفیق قاضی عبدالقادر صاحب تھے۔ جب ہم نے واہگہ بارڈر عبور کیا تو ہم کچھ سہمے ہوئے تھے کہ معلوم نہیں مشرقی پنجاب کے حالات کیا ہوں گے! یہ اندیشہ تھا کہ وہاں کا مسلمان تو گردن جھکا کر اور بہت خوف

وہراس کی کیفیت میں چل رہا ہوگا' لیکن امرتسر پہنچ کر ہمیں پہلی خوشگوار حیرت تو یہ ہوئی تھی کہ وہاں مسجدیں آباد ہیں' صاف ستھری ہیں اور وہاں کثیر تعداد میں مسلمان نظر آئے۔ موٹراڈے پر اتر کر جس آٹو رکشا پر ہم ریلوے سٹیشن جانے کے لئے سوار ہوئے اس کا ڈرائیور بھی مسلمان تھا۔ اس نے بتایا کہ ان دنوں کثیر تعداد میں کشمیر سے لوگ آ کر یہاں پر سردیاں گزارتے ہیں تو زیادہ چہل پہل ہوتی ہے اور مسجدیں بھی صاف ستھری اور بارونق ہو جاتی ہیں ۔ یہ بھی احساس ہوا کہ یہاں مسلمانوں میں خوف و ہراس والی کوئی بات نہیں۔ پھر ہم دہلی گئے تو اس احساس کو مزید تقویت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد علی گڑھ گئے تو وہاں تو ایک عجیب نقشہ نظر آیا۔ علی گڑھ یونیورسٹی کا کیمپس بہت وسیع وعریض ہے اور اسے وہاں ''چھوٹا پاکستان'' کہا جاتا ہے۔ شہر میں ہندوؤں کی اکثریت ہے اور وہ ذرا پہاڑی کے اوپر واقع ہے۔ میرا اپنا خیال تو یہ تھا کہ وہاں میرا کوئی تعارف نہیں ہے لیکن ایک تو ''میثاق'' کے ذریعے سے وہاں کے دینی حلقے مجھ سے واقف تھے' کیونکہ میں ۱۹۶۶ء سے ''میثاق'' نکال رہا تھا اور اسے ۱۴ سال ہو چکے تھے۔ دوسرے جماعت اسلامی کے حلقے بھی مجھ سے بخوبی واقف تھے' کیونکہ میں جماعت سے علیحدہ ہوا تو اس کے دس سال بعد میں نے ''تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ'' نامی کتاب شائع کی تھی۔ تو اس پہلو سے میرا تعارف تھا اور میری آمد کی وہاں فوراً اطلاع ہوگئی۔ اسی روز وہاں سیرت النبی ﷺ کا ایک جلسہ ہونے والا تھا' اس میں انہوں نے مجھے بھی خطاب کی دعوت دی اور میں وہاں حاضر ہوا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ یہاں ہندوستان میں انہیں اس اعتبار سے کوئی خوف نہیں ہے کہ ایک پاکستانی کو خطاب کے لئے بلا رہے ہیں۔ جلسہ ایک بڑے چوک میں تھا جہاں تین بازار آ کر ملتے تھے اور وہ سو فیصد ہندوؤں کا علاقہ تھا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ بڑے دھڑلے سے بُت پرستی کی مذمت کی جا رہی ہے اور ہندو مت پر تنقید ہو رہی ہے۔ چنانچہ میں نے بھی وہاں بے دھڑک پورے انشراح کے ساتھ سیرت النبی ﷺ کا انقلابی پہلو خوب کھول کھول کر لوگوں کے سامنے رکھا۔

دہلی میں بھی اور علی گڑھ میں بھی مجھ سے یہ بات کہی گئی کہ ۱۹۷۱ء سے پہلے ہم سمجھتے تھے کہ ہمارا محافظ پاکستان ہے' لیکن ۱۹۷۱ء میں پاکستان کے دولخت ہو جانے اور بڑی شرمناک شکست سے دوچار ہونے کے بعد اب ہم نے سمجھا ہے کہ پاکستان اپنی حفاظت ہی کر لے تو بہت ہے' ہمیں تو اَب یہیں رہنا ہے' یہیں مرنا ہے اور یہیں مارنا ہے۔ اب ایسا نہیں ہو گا کہ ہم بھیڑوں' بکریوں کی طرح قتل ہوں' بلکہ اب ہم لوگوں کو ماریں گے بھی اور مریں گے بھی۔ تو ۱۹۷۱ء کے بعد ایک طرح سے ان کے اندر ہمت بڑھی ہے' گھٹی نہیں۔ اپنے پہلے سفر بھارت سے واپسی پر میں نے مسجد شہداء میں خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں ہندوستان سے دو خوشخبریاں لے کر آیا ہوں۔ ایک تو یہ کہ ہندوستان میں ہندومت کا احیاء نہیں ہو سکا۔ اگر وہاں ہندومت کا احیاء ہو جاتا تو ہندوستانی مسلمانوں کے لئے صورتِ حال بہت ہی پریشان کن ہو جاتی۔ دوسرے یہ کہ بھارت میں کوئی مرکزی نیشنلزم وجود میں نہیں آ سکا' بلکہ علاقائیت کا دور دورہ ہے اور لوگ اپنی علاقائی زبانوں ہی کو اختیار کئے ہوئے ہیں۔ کوشش کی گئی تھی کہ ہندی کو سرکاری زبان بنا دیا جائے' لیکن کسی نے تسلیم نہیں کیا۔ صرف ہریانہ سے شروع ہو کر یوپی' بہار اور اڑیسہ تک کا جو علاقہ ہے یہ ایک ہندی بیلٹ ہے۔ باقی ہر علاقے کی اپنی زبانیں ہیں۔ تامل ناڈو میں تامل زبان ہے' کیرالا میں ملیالم زبان ہے' کرناٹک میں کلہڑی زبان ہے' جسے کلہڑا بھی کہتے ہیں' اور حیدر آباد کے علاقے میں' جو کہ اب آندھرا پردیش میں شامل ہو گیا ہے' تلوڑی زبان ہے۔ یہ بڑی پختہ اور مضبوط زبانیں ہیں' ان کا اپنا پس منظر ہے' ان میں لٹریچر موجود ہے' لہٰذا یہ ہندی کی بالادستی قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں پر نئے صوبے خالص لسانی بنیادوں پر بنائے گئے ہیں اور ہر صوبے میں سارا دفتری کام اپنی علاقائی زبان میں ہوتا ہے' جبکہ بین الصوبائی اور صوبوں کی مرکز سے خط و کتابت انگریزی میں ہوتی ہے۔ ویسے صوبہ کا لفظ وہاں متروک ہو گیا ہے اور امریکی انداز میں صوبوں کو ریاستیں (states) کہا جاتا ہے۔ اگر بھارت میں کوئی مرکزی نیشنلزم وجود میں آ جاتا تو بھارت بہت مضبوط ہو جاتا اور

پاکستان کے لئے بہت بڑا خطرہ بن جاتا۔ یہ دو خوشخبریاں میں نے ۱۹۸۰ء میں مسجد شہداء میں اپنی تقریر میں پیش کی تھیں۔

اس کے بعد دس پندرہ سال کے عرصے میں ایک بالکل برعکس صورت پیدا ہوئی۔ ہندوستان میں مَردوں کی جبری نَس بندی کا سلسلہ شروع ہوا تو مسلمانوں نے سمجھا کہ یہ خاص طور پر ہماری آبادی کو گھٹانے کے لئے ایک سازش ہے۔ چنانچہ اس پر انتہائی شدید ردِّعمل ہوا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے بعد ہونے والے الیکشن میں مسلمانوں کا ووٹ تقریباً ایک ''solid bank'' کی حیثیت سے اندرا گاندھی کے خلاف استعمال ہوا اور اندرا ہار گئی۔ اس نے جب یہ دیکھا کہ مسلم کارڈ اس کے خلاف استعمال ہونے کے نتیجے میں اسے شکست ہوئی ہے تو اب اس نے ہندو کارڈ استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ واضح رہے کہ اندرا گاندھی خاص طور پر اس گھرانے سے تعلق رکھتی ہے جو بڑے سیکولر ذہن کا حامل وسیع المشرب گھرانہ تھا۔ پنڈت موتی لال نہرو اُس کے دادا تھے۔ ایک طرف تو اُن کے متمول ہونے کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ہندوستان میں پہلی کار وائسرائے کی آئی تھی اور دوسری کار موتی لال نہرو کی۔ اندرا گاندھی کی پیدائش پر اُس نے پورے شہر الٰہ آباد کو دعوت دی تھی اور ہندو، مسلمان اور یورپین کے تین کیمپ بنا دیئے تھے، جن میں تینوں قوموں کے لئے ان کے اپنے باورچیوں کے ہاتھوں الگ الگ کھانا تیار ہو کر پیش کیا جا رہا تھا۔ مجھے یہ ساری تفصیلات پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم نے سنائی تھیں جو وہاں ایک ورکر کی حیثیت سے موجود تھے۔ دوسری طرف موتی لال نہرو کے سیکولر اور وسیع المشرب ہونے کا یہ عالم تھا کہ جب اُس سے پوچھا گیا کہ آپ کا مذہب کیا ہے تو اُس کا جواب یہ تھا کہ زبان کے اعتبار سے میں مسلمان ہوں، کیونکہ اردو بولتا ہوں، نسل کے اعتبار سے میں ہندو ہوں اور اپنے بود و باش اور رہن سہن کے اعتبار سے میں یورپین ہوں۔ پھر اُس کا بیٹا پنڈت جواہر لال نہرو بھی بہت وسیع القلب اور وسیع المشرب آدمی تھا۔ وہ سوشلسٹ تھا اور مذہب سے اسے کوئی سروکار تھا ہی نہیں۔ لیکن انتخابات میں شکست کے بعد اندرا گاندھی اپنے سیاسی حربے

کے طور پر مذہب کا کارڈ استعمال کرتی ہے اور اب وہ ہندو دیوی بن کر سامنے آتی ہے۔ چنانچہ وہ ہر مندر میں جا رہی ہے' پوجا کر رہی ہے اور شنکر اچاریہ کے پاس جا کر اُن کی اشیرواد لے رہی ہے۔

اسی زمانے میں دُوردرشن (ٹیلی ویژن) پر رامائن کی سیریز آئی اور اس میں این ٹی راما راؤ (جو بعد میں آندھرا پردیش کا چیف منسٹر بنا) نے رام چندر جی کا بہت عمدہ کردار ادا کیا۔ اس سے ہندو عوام اپنی تاریخ سے واقف ہوئے اور اپنے مذہب سے ان کی وابستگی میں اضافہ ہوا۔ علامہ اقبال نے کہا ہے کہ کسی قوم کی تاریخ کی حیثیت ایسے ہی ہوتی ہے جیسے کسی شخص کی یادداشت۔ اگر کوئی قوم اپنی تاریخ سے غافل ہو جائے تو وہ ایسے شخص کی مانند ہے جس کی یادداشت غائب ہو گئی ہو۔ جدید تعلیم یافتہ ہندوؤں کا بھی رامائن اور مہابھارت سے کوئی خاص تعلق نہیں رہا تھا' لیکن اب وہ تعلق زندہ ہو گیا جس کے نتیجے میں وہاں پر ہندو مذہب کا ایک طرح سے احیاء ہوا اور اُس کو ازسرِنو زندگی ملی۔ ہندومت کے اس احیاء کو ''ہندُتوا'' کا نام دیا گیا۔ اس کے بعد ہندوؤں کے جذبات یہ تھے کہ اب ہندوستان کے اندر ایک ہی شے ہو گی اور وہ ''ہندُتوا'' ہو گی' یعنی صرف ہندو تہذیب اور ہندو کلچر کا بول بالا ہو گا جبکہ باقی تمام تہذیبوں اور کلچرز کو اس کے اندر ضم ہونا ہو گا۔ اسی زمانے میں نعرے لگتے تھے کہ ''مسلمان کے دو استھان: پاکستان یا قبرستان''۔ یعنی اب یا تو ہم تمام مسلمانوں کو ختم کر دیں گے' قتل کر دیں گے یا یہ سب کے سب پاکستان دفع ہو جائیں جو انہوں نے اپنے لئے بنوایا تھا۔ تو اُس وقت یہ کیفیت بڑی شدت کے ساتھ اُبھری تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جس میں مسلمان پریشان تھے۔

۱۹۸۰ء سے ۱۹۹۱ء تک میں نے چار یا پانچ مرتبہ بھارت کا سفر کیا تھا اور اس دوران وہاں کے حالات سے وقتاً فوقتاً واقفیت حاصل ہوتی رہی۔ ان حالات میں مسلمانوں پر ایک خوف و ہراس کی کیفیت طاری ہوئی اور انھوں نے ''ہندُتوا'' کو اپنے لئے بہت بڑا خطرہ محسوس کیا۔ اسی ''ہندُتوا'' کے نتیجے میں آر ایس ایس کی گرفت زیادہ

مضبوط ہوئی اور اسی کے ایک پولیٹکل وِنگ کی حیثیت سے بی جے پی سامنے آئی، جس کے عروج کا زمانہ وہ ہے جب ایودھیا کی بابری مسجد کو شہید کیا گیا۔ اُس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بی جے پی ہندوستان کے سارے ہندوؤں کو اپنی پوری آغوش میں لے لے گی اور وہاں پر مسلمانوں کا رہنا بہت ہی دشوار ہو جائے گا۔ انہیں یا تو ''سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے'' کی کیفیت کے ساتھ ہندوؤں کے سامنے جھک کر رہنا پڑے گا یا انہیں ختم کر دیا جائے گا۔ یہ دراصل درمیانے دَور کی بات ہے۔

۱۹۹۱ء سے اب تک تیرہ سال کے دوران میں ایک مرتبہ (۱۹۹۴ء میں) صرف دو دن کے لئے مجلس اتحاد المسلمین کے زیر اہتمام سیرت کے جلسوں میں خطاب کے لئے بھارت گیا تھا۔ مجلس اتحاد المسلمین کی ایک سیاسی حیثیت بھی تھی۔ مجھے یہ دعوت صلاح الدین اویسی صاحب کی جانب سے ملی تھی جو وہاں ۲۱ برس تک لوک سبھا کے ممبر رہے ہیں۔ اب ان کا بیٹا وہاں سے منتخب ہو رہا ہے جبکہ انہوں نے سیاست سے کنارہ کشی کر لی ہے۔ مجلس اتحاد المسلمین کے زیر اہتمام حیدر آباد میں سیرت النبی ﷺ کا ایک عظیم الشان سالانہ جلسہ ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ میں سیرت کے دو جلسوں میں تقریریں کر کے واپس آ گیا۔ اس کے علاوہ کوئی اور پروگرام نہیں تھا۔ لہٰذا اس دو روزہ دورۂ بھارت کو میں قابل ذکر نہیں سمجھتا۔ اس اعتبار سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ میرا حالیہ دورۂ بھارت اصل میں تیرہ سال بعد ہوا ہے۔

رودادِ سفر

اپنے مشاہدات و تاثرات بیان کرنے سے قبل میں واقعاتی انداز میں اس دورہ کی روداد آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ میں یہاں سے ۲۲ نومبر ۲۰۰۴ء کو دہلی گیا تھا۔ دہلی میں چھ دن قیام رہا اور یہ چھ دن بہت بھرپور رہے۔ روزانہ شام کو بھی بہت بڑے بڑے جلسے ہوتے رہے اور دن کے اوقات میں بھی کئی پروگرام ہوئے۔ البتہ کھلے میدان میں صرف ایک جلسہ ہوا تھا۔ جمنا پار ایک بہت بڑی آبادی جعفر آباد

ہے' وہاں بہت بڑی عیدگاہ میں جلسہ ہوا' جس میں قریباً ۷ ہزار مردوں اور ۳ ہزار خواتین نے شرکت کی۔ باقی تمام پروگرام ہالز اور آڈیٹوریمز میں ہوئے۔ ہمدرد یونیورسٹی کے آڈیٹوریم میں میرے خطاب کے موقع پر تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ لوگ سیڑھیوں پر بھی بیٹھے تھے اور کوریڈورز میں بھی۔ بہت سے لوگ کھڑے بھی تھے۔ جن لوگوں کو کہیں جگہ نہیں ملی' وہ مایوس ہو کر چلے گئے۔ جامعہ ملیہ کے آڈیٹوریم میں بھی اسی کیفیت کے ساتھ میرا خطاب ہوا۔ دہلی میں سب سے بڑا ہال فکی آڈیٹوریم ہے۔ وہاں بھی یہی حال تھا کہ آڈیٹوریم کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ وہاں میری جو تقریر ہوئی وہ کیبل کے ذریعے براہ راست (live) ٹیلی کاسٹ بھی کی گئی۔ دہلی میں جماعت اسلامی ہند کا بہت بڑا مرکز ہے' جیسے یہاں منصورہ ہے۔ پہلے اُن کا دفتر جامع مسجد کے قریب گنجان آباد علاقے میں تھا' اور جب بھی میرا دہلی جانا ہوا میں وہاں حاضر ہوتا رہا ہوں۔ لیکن اب انہوں نے اوکھلہ کے قریب جامعہ ملیہ کے آس پاس جامعہ نگر میں ایک بڑا احاطۂ زمین لے کر وہاں اپنا مرکز بنایا ہے' جس میں دفاتر بھی ہیں اور بہت بڑی مسجد بھی ہے۔ ان حضرات نے مجھے وہاں بلایا اور میری ایک تقریر وہاں بھی ہوئی۔ اس کے ضمن میں کچھ باتیں میں بعد میں بھی عرض کروں گا۔ اس کے علاوہ دن کے اوقات میں بھی کچھ پروگرام ہوتے۔ کچھ وفود ملاقات کے لئے آ جاتے۔ کہیں سے کوئی دعوتِ طعام آ جاتی۔ میں اگرچہ ہر ایک کو انکار ہی کر رہا تھا لیکن کسی کسی جگہ پر ماننا بھی پڑ رہا تھا۔

دہلی میں عارف محمد خان سے بھی ملاقات ہوئی جو کانگریس کی حکومت میں مرکزی وزیر ہوتے تھے اور مجھے ''شاہ بانو کیس'' میں ان کے موقف کی وجہ سے ان سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ آپ کو یاد ہو گا کہ شاہ بانو کیس میں کلکتہ ہائی کورٹ نے ایک ایسی رولنگ دی تھی جو شریعت اسلامی پر ایک اضافہ تھا۔ کلکتہ ہائی کورٹ نے اپنے فیصلے میں کہا تھا کہ اگر کوئی مسلمان اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا ہے تو جب تک اس عورت کی دوسری شادی نہ ہو یا اُس کو موت نہ آ جائے' اُس کا نان نفقہ طلاق دینے والے شوہر کے ذمے رہے گا۔ جبکہ اسلام کے فیملی لاء میں صرف عدت کی حد تک عورت کا نان نفقہ سابق شوہر کے

ذمے ہے۔اس کے بعد اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ چونکہ مسلمانوں کے فیملی لاز میں دخل اندازی تھی لہٰذا مسلمانوں نے اس کے خلاف بہت بڑی تحریک چلائی تھی۔ یہ تحریک اندرا گاندھی کے دور میں چلی تھی اور مسلمانوں میں سے عارف محمد خان نے کانگریس کے اپنے نقطۂ نظر کے حوالے سے اس تحریک کی مخالفت کی تھی۔اس کے بعد جب راجیو کی حکومت آئی تو اُس نے اس تحریک کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے۔یہی وجہ ہے کہ میں نے بارہا ہندوستان کے مسلمانوں کو سلام کیا ہے کہ اگرچہ دبے ہوئے ہیں' پسے ہوئے ہیں' بدحال ہیں' معاشی طور پر بھی کمزور ہیں' اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اقلیت میں ہیں' لیکن انہوں نے اب تک اپنے فیملی لاز کے اندر ہندوستان کی کسی حکومت کو کوئی دخل دینے کی اجازت نہیں دی۔اس تحریک میں سینکڑوں مسلمانوں نے اپنی جانوں کی قربانیاں دیں' جس کے بعد حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پڑے اور راجیو گاندھی نے لوک سبھا (نیشنل اسمبلی) سے یہ قانون پاس کرایا کہ مسلم فیملی لاز میں ہندوستان کی کوئی عدالت بشمول سپریم کورٹ آف انڈیا دخل نہیں دے سکتی۔اس موقع پر راجیو گاندھی نے لوک سبھا کے فلور پر جو تقریر کی تھی اسے مولانا علی میاں نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔ راجیو نے کہا کہ میں نے پہلے تو مطالعہ نہیں کیا تھا' لیکن اب ہمارے ملک میں یہ جو تنازعہ شروع ہو گیا ہے تو میں نے مسلم فیملی لاز کا مطالعہ کیا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جتنے حقوق اسلام نے خواتین کو دیئے ہیں اتنے کسی مذہب نے نہیں دیئے۔ یہ ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی کامیابی تھی' لیکن عارف محمد خان نے چونکہ مسلم پرسنل لاء بورڈ کی تحریک کی مخالفت کی تھی اور مسلمانوں کے موقف کے خلاف بہت سی تقریریں کی تھیں لہٰذا مسلم پرسنل لاء کے حق میں قانون منظور ہونے کے بعد وہ احتجاجاً مستعفی ہو گئے تھے۔ان کے اس کردار کے باعث مجھے ان سے ایک طرح کا بُعد تھا۔ دہلی میں معلوم ہوا کہ عارف محمد خان میرے میزبان اطاعت کریم خان کے رشتہ دار ہیں۔ چنانچہ عارف محمد خان نے دعوت بھی دی اور ان سے گفتگو بھی ہوئی۔انہوں نے مسلم پرسنل لاء کے ضمن میں اپنا موقف بھی پیش کیا۔معلوم ہوا کہ انہیں ان معاملات

سے خاصی واقفیت ہے اور مسلم پرسنل لاء بورڈ کی تحریک کے دوران انہوں نے جو موقف اختیار کیا تھا وہ خالص بے حمیتی کی بنیاد پر نہیں' بلکہ مصلحت وقت کے تحت تھا۔

اطاعت کریم خان کے بارے میں آپ کو بتاتا چلوں کہ یہ تقریباً ۲۵ برس کا ایک خوبصورت' دراز قامت' جسیم نوجوان ہے۔ یہ رامپور کے علاقے کا پٹھان ہے اور اب اس کا خاندان کافی عرصے سے ریاض میں آباد ہے۔ سعودی عرب میں قیام کے دوران اطاعت کریم خان کو میرے دروس و خطابات سے ایسی دلچسپی پیدا ہوئی کہ دو سال پہلے اس نے مجھے فون کیا کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں نے اسے پاکستان آنے کا کہا' لیکن وہ کہنے لگا کہ اگر ہمارے پاسپورٹ پر پاکستان کا ٹھپہ لگ گیا تو انڈیا میں ہمیں کئی دقتیں پیش آ سکتی ہیں۔ میں بنگلہ دیش جا رہا تھا تو اس نے کہا کہ میں آپ سے ملنے (سعودی عرب سے) وہاں آ جاؤں گا' لیکن عین وقت پر کوئی ایسی مجبوری ہوئی کہ وہ نہیں آ سکے۔ پھر میں بحرین گیا۔ بحرین سے ریاض بہت قریب ہے۔ میں نے بحرین سے اسے فون کیا کہ میں یہاں آیا ہوا ہوں۔ اس کے بھائی نے فون receive کیا اور بتایا کہ وہ بنگلور گئے ہوئے ہیں۔ پھر اس نے بنگلور فون کر دیا۔ میری آمد کی اطلاع پا کر اطاعت کریم خان بنگلور سے بحرین پہنچا' پانچ چھ دن میرے ساتھ رہا اور پھر سیدھا بنگلور واپس چلا گیا۔ اطاعت کریم خان ہی کی دعوت پر دہلی میں چھ دن قیام کا پروگرام بنا تھا' ورنہ یہاں کے لئے ابتداءً صرف ایک دن رکھا گیا تھا۔ اس لئے کہ مجھے ڈاکٹر ذاکر نائیک نے بلایا تھا اور ان کا تعلق ممبئی (جنوبی انڈیا) سے ہے۔ انہوں نے پورے دس دن ممبئی کے لئے رکھے تھے' پونا کے لئے ایک دن اور بنگلور کے لئے دو دن۔ پانچ چھ دن حیدرآباد کے لئے رکھے گئے تھے' کیونکہ وہاں ہماری تنظیم اسلامی کے کچھ پرانے رفقاء موجود ہیں۔ دہلی کے لئے ایک ہی دن تھا اور اُن کے شیڈول کے مطابق مجھے ۲۸ نومبر کو جانا تھا' لیکن میں یہاں سے ۲۲ کو چلا گیا تاکہ دہلی والوں کو زیادہ دن دے سکوں۔ بہرحال دہلی میں بہت بھرپور پروگرام رہے۔

اس کے بعد میں تین روز کے لئے علی گڑھ گیا۔ بلندی پر واقع پرانے شہر کی بہت

بڑی مسجد میں خطاب کا موقع ملا۔ مسجد حاضرین سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی اور اس میں داخل ہوتے ہوئے اور وہاں سے نکلتے ہوئے اندیشہ تھا کہ میں کہیں ہجوم میں کچلا نہ جاؤں اور اژدحام کی وجہ سے کہیں میرا دم نہ نکل جائے۔ اگرچہ وہاں پر موجود کارکنوں نے پوری طرح ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر زنجیر بنائی ہوئی تھی کہ کسی کو آگے نہ آنے دیں' لیکن ریلے پر ریلا چلا آتا تھا۔

۲۸ نومبر کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کینیڈی ہال میں ''اُمت مسلمہ کا ماضی' حال اور مستقبل'' کے موضوع پر خطاب کا موقع ملا۔ حاضرین کی تعداد آٹھ ہزار تھی' جن میں قریباً ساڑھے چھ ہزار مرد اور ڈیڑھ ہزار خواتین تھیں۔ اگلے روز عبداللہ گرلز کالج' علی گڑھ یونیورسٹی میں ''مسلمان خواتین کی ذمہ داریاں'' کے موضوع پر خطاب ہوا۔ اس کے بعد میں واپس دہلی آیا جہاں ایک دن مزید گزارا اور پھر ہم ممبئی چلے گئے۔

میرے حالیہ دورۂ بھارت کا مرکزی پروگرام ممبئی ہی میں تھا' جہاں پر مسلسل دس دن ایک ہی میدان میں لیکچرز ہوئے۔ پہلے دن کی حاضری دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ کم وبیش دس ہزار حاضرین تھے' جن میں سات ساڑھے سات ہزار مرد اور اڑھائی تین ہزار عورتیں تھیں۔ میرا خیال تھا کہ حاضری روز بروز کم ہوتی جائے گی' لیکن دن بدن تقریباً ایک ہزار روزانہ کے حساب سے تعداد بڑھتی گئی' اور وہاں پر جو میرا آخری خطاب ہوا اس میں ۱۵ ہزار کی حاضری تھی—— ۵ ہزار خواتین اور دس ہزار مرد۔ مسلسل دس روز تک مکمل سکوت کے عالم میں لوگ گوش برآواز رہے۔ روزانہ سات بجے سے دس بجے رات تک تین گھنٹے کا سیشن ہوتا تھا۔ وہاں پر حکومت نے ایک اچھا قانون منظور کر رکھا ہے کہ رات دس بجے کے بعد کوئی لاؤڈ سپیکر قطعاً استعمال نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا سارے جلسے اور ساری تقریبات دس بجے سے پہلے پہلے ختم ہوجاتے ہیں۔ اسی لئے وہ پروگرام سات بجے شروع کرتے تھے۔ دو سوا دو گھنٹے کی میری تقریر ہوتی اور پھر چالیس' پینتالیس منٹ یا ایک گھنٹے کے سوال وجواب ہوتے۔

ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب نے اس پروگرام پر بے پناہ خرچ کیا۔ انہوں نے اس

پروگرام کے لئے جو وسیع و عریض میدان لیا اس کا دس دن کا کرایہ مجھے نہیں معلوم کیا ہوگا۔ پروگرام کی مکمل کوریج کے لئے بہت سے ویڈیو کیمرے لگائے گئے تھے۔ ایک بڑا سا کیمرہ کرین پر نصب تھا' تا کہ اوپر سے دور تک کوریج کی جا سکے۔ اس کرین کا کرایہ پچاس ہزار روپے روزانہ تھا۔ گویا پانچ لاکھ روپیہ تو انہوں نے صرف اس ایک کیمرے پر خرچ کیا۔ باقی انتظامات بھی بہت اعلیٰ درجے کے تھے۔ روشنی کے انتظامات پر بھی لاکھوں کا خرچ ہوا ہوگا۔ لیکن انہوں نے مجھے پھر نچوڑا بھی خوب۔ دن میں وہ کوشش کرتے رہے کہ میں مختلف موضوعات پر آدھے آدھے گھنٹے کے chunks میں ویڈیوز تیار کروا دوں تا کہ وہ انہیں مختلف مواقع پر ٹیلی ویژن کے مختلف چینلز پر دے سکیں۔ پھر یہ کہ انہوں نے تین چار اجلاس خود اپنے رکھے۔ دو مردوں کے لئے' ایک خواتین کے لئے اور ایک جو اُن کا inner core تھا اس کے لئے۔ ایک سکول وہ شروع کر رہے ہیں' اس میں بھی مجھے دو مرتبہ خطاب کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ دو خطابات جمعہ کا موقع بھی ملا۔ بہر حال میرے وہ دس دن انتہائی شدید مصروفیت میں گزرے۔ میں حیران ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس قدر رہمت دی اور میری بلڈ پریشر اور شوگر جیسی شکایات میں سے کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکی۔ اس کی ایک وجہ یہ انشراحِ صدر اور انبساطِ طبیعت بھی تھا کہ اب دعوتِ قرآنی کا معاملہ کس درجے آگے تک پھیل گیا ہے! مجھے بتایا گیا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا شاید ہی کوئی گھر ایسا ہوگا جس میں Qtv کے ذریعے آپ کے دروس نہ سنے جا رہے ہوں۔ خاص طور پر ممبئی میں گزشتہ آٹھ' دس سال سے IRF کے زیر انتظام میرے دروسِ قرآن کے ویڈیوز وہاں کے لوکل کیبل کے ذریعے سے آٹھ دس ہزار گھرانوں میں ہفتے میں دو مرتبہ دیکھے جا رہے تھے۔ اس طرح اگرچہ ممبئی میں تو بہت کام ہو چکا تھا' لیکن باقی ہندوستان میں ظاہر بات ہے کہ یہ Qtv کی وجہ سے ہوا۔

دس دن کے پروگرام کے بعد میں ممبئی سے ایک دن کے لئے پونا گیا۔ وہاں بھی بہت بڑا جلسہ ہوا۔ پھر دو دن کے لئے بنگلور گیا۔ بنگلور اب انڈیا کا بہت اہم شہر اور

کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے اعتبار سے بہت بڑا مرکز ہے۔ سافٹ ویئر اور ہارڈ ویئر کی تیاری میں یہ دنیا کے اُس مشہور و معروف مرکز کو بھی مات دے چکا ہے جو امریکہ میں واقع ہے۔ صدر کلنٹن جب ہندوستان کے پندرہ روزہ دورے پر آئے تھے تو باقاعدہ ایک دن بنگلور دیکھنے کے لئے بھی گئے۔ بہرحال وہاں بھی دو بہت اعلیٰ جلسے ہوئے جن میں حاضری کافی زیادہ رہی۔

بنگلور سے میں حیدرآباد آیا' جہاں میری پرانی شناسائی بھی کافی تھی۔ پہلے کم سے کم تین مرتبہ میں وہاں جا چکا ہوں۔ جب میں پہلی مرتبہ گیا تھا تو وہاں کی مرکزی مسجد ''مکہ مسجد'' میں مَیں نے تین دن تک ''حقیقت و اقسامِ شرک'' کے موضوع پر تقاریر کی تھیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے پندرہ پندرہ ہزار حاضرین کے اجتماعات سے خطاب کیا تھا۔ ان اجتماعات میں روزانہ دس ہزار مرد اور پانچ ہزار عورتیں شریک ہوتیں' اور عورتیں سب کی سب برقعے میں ہوتیں۔ میں نے واپس آ کر یہ کہا تھا کہ جتنے برقعے میں نے شہر حیدرآباد میں دیکھے ہیں شاید اتنے برقعے اب پورے پاکستان میں بھی نہیں رہے۔ بہرحال میں نے آپ کو اپنے سفر کی مختصر سی روداد سنا دی ہے۔

دورۂ بھارت کے دوران مسلمانانِ ہند نے مجھ سے بے پناہ عقیدت و محبت کا اظہار کیا۔ ظاہر بات ہے کہ یہ عقیدت قرآن ہی کی وجہ سے ہے۔ لوگ مصافحہ کرنے کو بیتاب ہوتے تھے' حالانکہ ہر دفعہ میں اپنی تقریر کے آخر میں کہہ دیتا تھا کہ میں بہت کمزور بھی ہوں اور اِس وقت تھک بھی چکا ہوں' تین گھنٹے کا سیشن ہے' خدا کے لئے مجھے ہاتھ ملانے اور مصافحہ کرنے سے محفوظ رکھیں۔ لیکن لوگ پھر بھی ٹوٹے پڑتے تھے۔ انہیں جو لوگ میرے ساتھ نظر آتے تھے' ان سے بھی ہاتھ ملاتے تھے۔ یہ معاملہ میری توقع سے کہیں زیادہ تھا اور مجھے اس کا پہلے سے بالکل اندازہ نہیں تھا۔ چند ماہ قبل دہلی میں ایک ''کتاب میلہ'' لگا تھا' جس میں پاکستان کے چند پبلشرز نے اپنی کتابوں کے سٹال لگائے تھے۔ مرکزی انجمن خدام القرآن کے مکتبہ نے بھی وہاں سٹال لگایا تھا اور مولانا شیخ رحیم الدین صاحب کی سربراہی میں ہماری ایک ٹیم وہاں گئی تھی۔ انہوں نے

واپس آ کر وہاں کا نقشہ بیان کیا تھا کہ لوگ میرے کیسٹ کس درجے شوق سے سن رہے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ شاید دہلی میں کوئی گھر ایسا نہیں ہے جس میں آپ کا ویڈیو نہ دیکھا جا رہا ہو۔ لیکن یہ بھی میرے لئے خبر کے درجے کی چیز تھی' اور ع شنیدہ کے بود مانندِ دیدہ! لیکن اِس وقت جو کچھ میں دیکھ کر آیا ہوں' وہ تو میری اپنی دید ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ لوگوں نے کس درجے عقیدت کا اظہار کیا اور لوگ کہاں کہاں سے ملنے آئے۔ ایک صاحب' جو ایک درگاہ کے مسند نشین ہیں' بڑودہ سے چل کر مجھ سے ملنے آئے۔ جے پور سے' کانپور سے اور بھوپال سے لوگ چل کر آئے۔ دور دور سے وفود ذوق وشوق سے آتے تھے اور ملاقات کے لئے وقت مانگتے تھے' لیکن میرے پاس وقت نہیں ہوتا تھا۔ بس مختصر سی ملاقات ہو جاتی تھی۔

مشاہدات وتاثرات

مسلمانوں کی حالت میں بہتری

اب میں اپنے دورے کے مشاہدات پیش کرتا ہوں۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ وہاں کے مسلمانوں کی حالت اب بہت بہتر ہو چکی ہے' ان میں بڑی خود اعتمادی ہے۔ خاص طور پر جنوبی ہند کا مسلمان اب اپنے ابنائے وطن کے ساتھ بالکل کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا ہوا ہے۔ مسلمان کسی درجے میں بھی نہ خوفزدہ ہیں' نہ مرعوب ہیں۔ تعلیمی ترقی بھی اس عرصے میں بہت ہوئی ہے۔ مسلمانوں نے بڑی تعداد میں اپنے ادارے قائم کر لئے ہیں۔ سرکاری تعلیمی اداروں میں مسلمان عام طور پر competition کی وجہ سے داخلہ نہیں لے سکتے تھے' کیونکہ پہلے سے ہی تعلیم میں کمزور تھے' لیکن اب انہوں نے اپنے سکول اور کالج قائم کر لئے ہیں' اپنے ٹیکنیکل کالج بھی بنا لئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں اب تعلیم یافتہ لوگوں کی شرح بہت زیادہ ہو گئی ہے اور ان کو اب اعلیٰ سطح کی سرکاری ملازمتیں بھی مل رہی ہیں۔ کرناٹک کا انسپکٹر جنرل آف پولیس مسلمان ہے۔ وہ مجھ سے بڑی عاجزی کے ساتھ ملا اور اصرار

کے ساتھ دعوت دی کہ آپ میرے گھر آ نہیں سکتے تو کم سے کم وہاں سے گزر جائیں' میں باہر آ کر آپ سے مل لوں گا۔ چنانچہ جب میں ایک تقریر کے لئے جا رہا تھا تو ہم ایک دو منٹ کے لئے اس کے گھر کے باہر رکے' وہ ننگے پاؤں دوڑتا ہوا آیا اور بڑی عقیدت کے ساتھ ملا۔ اس نے بتایا کہ وہ پورے ہندوستان میں انڈین پولیس سروس کا واحد مسلمان آئی جی ہے۔ لیکن ان لوگوں کے اندر حد درجہ تواضع ہے' غرور و تکبر بالکل نہیں ہے۔ خاص طور پر جنوبی ہند کا مسلمان شمالی ہند کے مسلمان سے بڑا مختلف ہے۔ یہ لوگ متحمل مزاج ہیں' دھیمی طبیعت کے ہیں اور معاملات میں صاف ہیں۔ ان کے ہاں دھوکہ' فریب نہیں ہے۔ جو دل میں ہے وہی زبان پر ہے۔ اس کا ایک خاص سبب یہ ہے کہ شمالی ہند میں اسلام تلوار کے ساتھ آیا تھا' لیکن یہ خطہ عرب تاجروں کے ذریعے اسلام سے متعارف ہوا۔ جس طرح سماٹرا' جاوا (انڈونیشیا) اور ملایا وغیرہ کے علاقوں میں عرب تاجروں کے ذریعے سے اسلام پہنچا' اسی طرح عرب تاجروں کے قافلے ہندوستان کے مغربی ساحل پر بھی آتے تھے اور یہاں تجارت کرتے تھے۔ تاجر خوش اخلاق ہوتا ہے' اگر تاجر کج رُو ہو تو اس کا سامان کون خریدے گا؟ چنانچہ عرب تاجروں کی خوش اَخلاقی سے متاثر ہو کر اور ان کے سیرت و کردار میں اسلام کی برکات دیکھ کر یہاں کے پورے مغربی ساحل پر آباد لوگ مسلمان ہو گئے (ابھی جو تباہی آئی ہے وہ مشرقی ساحل پر آئی ہے)۔ ان علاقوں میں کیرالا ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ ایک اور علاقہ بھٹکل ہے' وہاں مسلمانوں کی ایک بڑی مضبوط کمیونٹی ہے جو ''نوایتے'' کہلاتے ہیں۔ وہ نسلی طور پر عرب ہیں اور صدیوں سے وہاں آباد ہیں۔ ان کی بڑی طاقت اور بڑی دھاک ہے۔ پھر کوکن کا علاقہ ہے' یعنی مہاراشٹر کا ساحلی علاقہ' جہاں کے مسلمان بڑے باعمل ہیں۔ یہاں پر بڑے بڑے مسلمان عالم پیدا ہوئے ہیں۔ اس سارے علاقے میں اسلام چونکہ مسلمان تاجروں اور صوفیاء کے ذریعے پھیلا لہٰذا یہ لوگ اپنے مزاج اور کردار میں ہم سے مختلف ہیں' ہماری طرح مشتعل مزاج نہیں ہیں۔

بھارت کے مسلمانوں کا کہنا ہے کہ پہلے تو ہمیں ۱۹۷۱ء کے سانحے نے جگایا تھا۔ اس سے پہلے ہم یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان ہمارا محافظ ہے۔ اب ہم نے سوچا کہ پاکستان تو اپنی حفاظت ہی کر لے تو بہت ہے' ہمیں تو خود یہاں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا ہے۔ یہاں کے مسلمانوں میں بیداری کی دوسری لہر ۱۹۹۲ء میں آئی جب ایودھیا میں بابری مسجد گرائی گئی۔ اس سے مسلمانوں کے اندر جو جذبہ اُبھرا اس نے ایک بہت تعمیری شکل اختیار کی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی تعلیمی ترقی اور صنعت و تجارت پر خصوصی توجہ دی۔ خصوصاً جنوبی ہند کی صنعت اور تجارت میں مسلمانوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ وہاں بڑے بڑے صنعت کار اور کاروباری لوگ موجود ہیں۔ ان کی معاشی حالت بہت اچھی ہے اور ان کے معاملات بہت عمدہ ہیں۔

مسلمان تحریکیں اور تنظیمیں

اِس وقت بھارت میں مسلمان تحریکیں اور تنظیمیں بہت متحرک اور فعّال ہیں۔ ان میں سب سے پہلے میں جماعت اسلامی کا ذکر کروں گا۔ جماعت اسلامی جیسے یہاں منظّم ترین جماعت ہے ایسے ہی وہاں بھی منظّم ترین جماعت ہے۔ اگرچہ اس کا عوامی حلقہ پاکستان کی طرح وہاں بھی کم ہے' لیکن انہوں نے ایک بہت بڑا کام یہ کیا ہے کہ تمام مقامی زبانوں میں قرآن مجید کے تراجم تیار کر کے ان کو بہت عام کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ہندی اور دوسری مقامی زبانوں میں اخبارات اور ہفت روزہ و ماہانہ رسائل و جرائد جاری کئے ہیں' جن کے ذریعے سے وہاں کے مڈل کلاس طبقہ کے اندر اسلام کی دعوت پہنچ رہی ہے۔ مزید برآں وہ سماجی خدمات کے میدان میں بھی سرگرم ہیں۔ سیاست کا میدان اگرچہ بند ہے' تاہم وہ نظر رکھتے ہیں کہ کس موقع پر کون سی جماعت مسلمانوں کے لئے بہتر ثابت ہوگی۔ چنانچہ وہ مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ اس جماعت کو ووٹ دیئے جائیں۔ لیکن وہ خود الیکشن میں نہیں آتے۔ جماعت اسلامی ہند کے ساتھ ہمیشہ میرا رابطہ رہا ہے' میں جب بھی دہلی گیا ہوں تو اُن کے مرکز میں ضرور حاضری دی' اور میں نے وہاں محسوس کیا کہ جیسے یہ میرا اپنا گھر ہے۔ یہاں والا

معاملہ نہیں ہے کہ یہاں کی جماعت مجھ سے کچھ الرجک بھی ہے' مجھ سے بُعد محسوس کرتی ہے اور پالیسی کے اختلاف کی وجہ سے وہ مجھے اپنا مخالف بھی سمجھتی ہے۔ وہاں کا معاملہ ہمیشہ مختلف رہا ہے۔ وہاں کے امیر جماعت مولانا ابواللیث صاحب ہوتے تھے' ان سے بھی کئی ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ پھر مولانا سراج الحسن صاحب سے بھی ملاقاتیں رہیں جن کا تعلق جنوبی ہند سے تھا۔ وہ تو شکلاً میرے بہت مشابہ تھے۔ کئی دفعہ لوگ ان کو دیکھ کر یہ سمجھ بیٹھتے کہ شاید میں ہوں۔ اب وہاں کے امیر انصاری صاحب ہیں' جو ہارورڈ کے پڑھے ہوئے ہیں۔ اس مرتبہ بھی انہوں نے مجھے اپنے ہاں بلایا اور خطاب کا موقع دیا۔ میں نے وہاں بھی جماعت اسلامی پاکستان کی پالیسی سے جو میرا اختلاف ہے' اسے کھل کر بیان کیا۔ اس کے بعد جب میں پرسنل ملاقات کے لئے گیا تو انہوں نے تھوڑا سا شکوہ کیا کہ دیکھئے ہم سب پر مولانا مودودیؒ کا بہت احسان ہے' تو آپ نے ان کے انتخابی سیاست میں آنے کے فیصلے کے لئے ''بلنڈر'' کا جو لفظ استعمال کیا وہ بہت سخت تھا' آپ اسے غلطی کہہ لیں۔ میں نے کہا کہ میں اسے جس درجے کی غلطی سمجھتا ہوں' اس حوالے سے میرے جذبات و خیالات کی ترجمانی ''بلنڈر'' سے کم کسی اور لفظ سے نہیں ہوسکتی۔ اس پر انہوں نے مسکراہٹ کے ساتھ خاموشی اختیار کر لی۔ تو جماعت اسلامی ہند کے ساتھ میری ایک بڑی ذہنی ہم آہنگی موجود ہے۔

بھارت میں ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب کا ادارہ اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن (IRF) بھی بہت کام کر رہا ہے۔ اوّل تو ذاکر نائیک خود انتہائی فعال آدمی ہیں۔ آپ نے انہیں ٹیلی ویژن پر دیکھا ہوگا۔ ابھی بیالیس برس کے ہوئے ہیں' گویا نوجوان ہیں۔ دُبلے پتلے ہیں' لیکن یوں لگتا ہے جیسے ان میں بجلی بھری ہوئی ہے۔ ہر کام کو وہ خود انتہائی مستعدی سے کنٹرول کر رہے ہوتے ہیں۔ میری تقریروں کے دوران وہ تمام تر انتظامات کی نگرانی خود کرتے اور تین گھنٹے تک ان کا یہ حال رہتا جیسے مچھلی کو سمندر سے باہر لے آئیں تو وہ تڑپتی رہتی ہے۔ وہ بڑے ہائی ٹیکنیکل لیول پر ریکارڈنگ کرتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ یہاں جو میرے شام کے دس لیکچر ہوئے ہیں ان میں

سے کسی ایک لیکچر کی ویڈیو کاپی ہمیں دے دیں تا کہ ہم جا کر اپنے ساتھیوں کو دکھا سکیں' لیکن انہوں نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ آپ کے ایک ایک ویڈیو کی ایڈیٹنگ پر میرا ایک ایک مہینہ لگے گا' پھر میں اس کو ریلیز کروں گا۔ جب میں نے اصرار کیا کہ پندرہ منٹ کا کوئی chunk نکال کر ہی ہمیں دے دیں' تو انہوں نے بادلِ نخواستہ پندرہ منٹ کا ایک chunk نکال کر دیا۔ اسے دیکھ کر آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ حاضری کی جو کیفیت میں کہہ رہا ہوں' وہ کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ میں آپ کو صحیح ترین اعداد وشمار بتا رہا ہوں' اس لئے کہ کرسیاں گنی ہوئی ہوتی تھیں۔ آخری دن دس ہزار کرسیاں تھیں' جو ساری کی ساری پُر تھیں اور پھر بھی کچھ لوگ کھڑے تھے۔ اسی طرح خواتین کے لئے چار ہزار کرسیاں علیحدہ تھیں' جن میں سے بھی کوئی خالی نہ تھی۔ لہٰذا گنتی میں کسی غلطی کا امکان ہے ہی نہیں۔

میں ذاکر نائیک صاحب کا تعارف کرا دوں۔ وہ ۹۳۔۱۹۹۲ء میں پاکستان آئے تھے۔ ابھی نوجوان ڈاکٹر تھے' پریکٹس بھی کر رہے تھے۔ دل میں کچھ کرنے کا جذبہ تھا۔ انہوں نے پورے پاکستان کا دورہ کیا اور مجھ سے بھی ملے۔ کہنے لگے کہ پاکستان میں دین کے نام پر جتنے کام ہو رہے ہیں میں نے ان سب کا جائزہ لے لیا ہے اور میرے نزدیک صحیح رُخ پر صرف آپ کام کر رہے ہیں۔ اُس وقت وہ ساٹھ ہزار روپے مالیت کے ہمارے آڈیو اور ویڈیو لیسٹس لے کر گئے تھے' جن کی ریکارڈنگ مارکیٹ میں دستیاب عمدہ tapes پر خاص طور پر کروائی گئی تھی۔ ان کے والد عبدالکریم نائیک بہت بڑے psychiatrist ہیں۔ ڈاکٹر رشید چودھری صاحب مرحوم کے وہ بڑے گہرے دوست تھے۔ دو مرتبہ پاکستان آئے بھی ہیں۔ ہماری اکیڈمی کا بھی انہوں نے visit کیا تھا۔ لیکن میں چونکہ دونوں مرتبہ ملک سے باہر تھا لہٰذا اُن سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی' تو ممبئی میں ان سے میری یہ پہلی ملاقات تھی۔ ذاکر نائیک صاحب نے ایک بلڈنگ کے دو فلیٹس کو باہم جوڑ کر اپنی بہت عمدہ رہائش گاہ بنائی ہوئی ہے' جو انہوں نے ہمارے لئے خالی کرا دی تھی۔ دس گیارہ دن انہوں نے ہماری میزبانی کا پورا پورا حق

ادا کیا۔ ذاکر صاحب جب پاکستان کے دورے پر آئے تھے تو میں نے ان سے کہا تھا کہ آپ کو اگر واقعی دین کا کوئی کام کرنا ہے تو اپنی میڈیکل پریکٹس کو ترک کرنا ہوگا' یہ دو کام ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ اس کے بعد میری ان سے ملاقات نہیں رہی' صرف امریکہ میں ایک مختصر ملاقات ہوئی تھی۔ البتہ میرے چھوٹے بیٹے آصف حمید سے آڈیو ویڈیو ریکارڈنگ کے سلسلے میں اُن کا رابطہ رہا ہے۔ بہرحال اب انہوں نے مجھے یہ کہہ کر دورۂ بھارت کی دعوت دی کہ چونکہ آپ کے کہنے پر میں نے پریکٹس چھوڑ دی ہوئی ہے لہٰذا اب آپ کو یہ دعوت قبول کرنی چاہئے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے' میں بسر وچشم حاضر ہونے کو تیار ہوں۔

اصل میں ان کا فروری ۲۰۰۴ء کا پروگرام تھا' لیکن بھارتی حکومت نے ویزا دینے میں تاخیر کر دی۔ اس کے لئے بھارتی ہائی کمیشن نے بھارت کی سنٹرل گورنمنٹ سے اجازت حاصل کی۔ چنانچہ اس میں وقت لگا اور جب ویزا ملا تو وہاں شدید حبس والی گرمی کا موسم شروع ہو چکا تھا اور بارشیں شدید ہو رہی تھیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ مجھے کسی کھلے میدان میں خطابات کرنے ہوں گے جبکہ میں اسے ناپسند کر رہا تھا' اس لئے کہ میرا مزاج اس کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ کافی زیادہ لوگوں کی آمد متوقع ہے اور وہ کسی ہال میں سما نہیں سکتے' لہٰذا ہمیں کھلے میدان میں پروگرام کرنا پڑے گا' اور ایسا ہم ان دنوں میں نہیں کر سکتے' اس لئے اب آپ دسمبر میں آئیں۔ مجھے اُن سے تھوڑا سا گلہ بھی رہا کہ میں نے اپنا ذہن بنا لیا ہے اور آپ اسے بہت زیادہ مؤخر کر رہے ہیں۔ کہاں فروری مارچ اور کہاں نومبر دسمبر! لیکن وہاں جا کر معلوم ہوا کہ ان کی بات صحیح تھی۔ جتنے لوگ آ رہے تھے' کسی ہال میں ان کے سمانے کا امکان ہی نہیں تھا۔

ذاکر نائیک صاحب شیخ احمد دیدات سے بھی بہت متاثر ہیں' جنہوں نے اس دور میں عیسائیت میں سپیشلائز کیا ہے۔ میرے نزدیک وہ اس دور کے مولانا رحمت اللہ کیرانوی ہیں جنہوں نے پادری فنڈر کو شکست دی تھی۔ اگر اُس وقت اسے شکست نہ دی گئی ہوتی تو شاید پورا ہندوستان عیسائی ہو جاتا۔ وہ شخص جرمن تھا اور بہت

learned آدمی تھا۔ عربی، آرامی اور فارسی کا پوری طرح ماہر تھا۔ اس کا قرآن کا مطالعہ بھی بہت زیادہ تھا۔ وہ جب ہندوستان آیا تو کلکتہ میں اس نے پہلا مناظرہ کیا۔ کلکتہ ہی سے برٹش گورنمنٹ پورے ہندوستان پر قابض ہوئی تھی، پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت تھی۔ کلکتہ ہی میں انگریزوں نے پہلا پریس قائم کیا تھا اور وہاں پر بائبل کا اردو اور دیگر مختلف زبانوں میں ترجمہ کرا کے بہت بڑے پیمانے پر شائع کیا تھا۔ تو وہاں پادری فنڈر نے مسلمان علماء کو مناظرے کا چیلنج دیا اور سب کو ہرا دیا۔ پھر وہ وہاں سے بنگال کے مختلف شہروں بہار، یو پی سے ہوتا ہوا آیا اور ہر جگہ پر علماء کو شکست دی۔ ہمارے علماء نے کبھی بائبل اور تورات کی صورت نہیں دیکھی، بلکہ عام طور پر بائبل اور تورات کا پڑھنا گناہ سمجھتے ہیں، تو اب کیا جواب دیں! کاؤنٹر اٹیک کے بغیر مناظرے کے اندر کامیابی ممکن نہیں۔ مناظرے میں تو دراصل مخاطب کو شکست دینا اور اسے کسی طریقے سے چپ کرانا مقصود ہوتا ہے۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم نے مجھے یہ واقعہ سنایا تھا کہ شہنشاہ شاہجہاں کے دربار میں عیسائی اور مسلمان علماء کا مناظرہ ہوا تھا۔ اس کا پس منظر یہ تھا کہ شاہجہاں کو بواسیر ہوگئی تھی اور اس کی وجہ سے تخت پر بیٹھنا مشکل ہوگیا تھا۔ اب وہ بادشاہ جو تخت پر بھی نہ بیٹھ سکے وہ بادشاہ کہاں رہا! اس کا علاج نہ کوئی جراح کر سکا اور نہ کوئی حکیم۔ اس زمانے میں کاروباری سلسلہ میں مغربی اور مشرقی ساحل پر انگریزوں کی کچھ آمد و رفت شروع ہوگئی تھی۔ ایک انگریز سرجن نے آ کر سرجری کی تو بادشاہ ٹھیک ہوگیا۔ بادشاہ نے احسان کے بدلے کے طور پر پوچھا کہ کیا مانگتے ہو، تو اس سرجن نے کہا کہ ہمیں تجارتی حقوق چاہئیں کہ ہم یہاں اپنی کوٹھیاں بنا سکیں۔ چنانچہ سارے ساحل میں ان کی تجارتی کوٹھیاں بن گئیں اور ان میں چپکے چپکے سے اسلحہ بھی آنا شروع ہوگیا۔ اسی شاہجہاں کے دربار میں انگریز پادریوں نے مسلمان علماء کے ساتھ مناظرہ کیا۔ درباری علماء میں ہر علاقے کے چوٹی کے لوگ جمع ہوتے تھے، لیکن پادریوں نے درباری علماء کو شکست دی۔ ایک پادری نے ایک آیت پیش کی تو تمام علماء نے کہا کہ یہ

قرآن میں ہے ہی نہیں۔ اس نے قرآن منگوا کر کھول کر دکھایا تو وہ آیت موجود تھی۔ اب اندازہ کیجئے کہ ان علماء کی کیا حالت ہوئی ہوگی!

اسی طرح کا فنڈر کا معاملہ ہو رہا تھا۔ کلکتہ میں علماء کو شکست دینے کے بعد وہ کئی شہروں سے ہوتا ہوا دہلی آیا اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر اس نے اعلان کیا: مسلمانو! میں کلکتے سے چل کر یہاں تک آ گیا ہوں' کہیں پر بھی کوئی مسلمان مجھ سے مناظرہ نہیں کر سکا اور مجھے ہرا نہیں سکا' اب میں پورے ہندوستان کے علماء کو چیلنج کر رہا ہوں کہ آئیں اور میرا مقابلہ کریں۔ اُس وقت مولانا رحمت اللہ کیرانوی کھڑے ہوئے اور انہوں نے فنڈر کو شکست دی۔ اُس وقت انگریز غالب اور فاتح کی حیثیت سے آ رہا تھا' ساتھ ہی اگر یہ بات بھی عوام کے سامنے آتی کہ ہمارے علماء تو مار کھا گئے' تو ارتداد اور تبدیلیٔ مذہب کا معاملہ کس بڑے پیمانے پر ہوتا' آج آپ تصور نہیں کر سکتے۔ انگریز سے مرعوبیت تو پہلے سے تھی۔ بہرحال اِس زمانے میں ایک دوسرا رحمت اللہ کیرانوی پیدا ہوا ہے اور وہ ہے شیخ احمد دیدات۔ اب بہت عرصے سے وہ صاحب فراش ہیں۔ تقریباً پورا جسم مفلوج ہے' صرف آنکھیں کام کرتی ہیں اور آنکھوں کی مدد سے ہی کچھ communication ہوتی ہے۔ لیکن ان کے شاگرد کی حیثیت سے ڈاکٹر ذاکر نائیک نے جو نام اور مقام حاصل کیا ہے اُس کے حوالے سے یہ احمد دیدات پلس (+) ہیں' یعنی ان سے آگے ہیں' کم نہیں ہیں۔ احمد دیدات کا انداز بہت زیادہ جارحانہ ہے' جبکہ ان کا انداز نسبتاً کم جارحانہ ہے۔ مناظرے کے اندر جارحانہ انداز اختیار کرنا پڑتا ہے۔

اب انہوں نے ایک بہت بڑا اور اہم کام یہ شروع کیا ہے کہ ہندوستان کی چوٹی کی مذہبی کتابوں مثلاً وید وغیرہ کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کے حوالے سے ابھی پچھلے دنوں ان کا ایک بہت بڑا پروگرام ٹیلی ویژن پر نشر ہوا جو اتفاق سے میں نے بھی یہاں دیکھا۔ اس کا عنوان تھا: ''Similarities between Hinduism and Islam''۔ انہوں نے بہت گہرے مطالعہ کے بعد یہ پروگرام پیش کیا اور بتایا کہ

ویدوں میں خالص توحید موجود ہے اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں ان کا تصور ہے: ''ایکیم دوناستم''، یعنی وہ ایک ہی ہے' اس کے ساتھ دوسرا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ جیسے قرآن مجید میں ہے:

﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝١ اللّٰهُ الصَّمَدُ ۝٢ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝٣ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝٤﴾ (الاخلاص)

مزید برآں ان ویدوں میں حضورﷺ کا نام لے کر پیشین گوئیاں کی گئی ہیں۔ ایک پیشین گوئی ہے کہ حضورﷺ اونٹ پر سوار ہوں گے' دس ہزار کا لشکر لے کر جائیں گے اور فتح حاصل کریں گے۔ یہ فتح مکہ کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ ہم نے ہندوستان پر آٹھ سو برس یا ایک ہزار برس حکومت کی ہے اور عیش کئے ہیں' لیکن ہندو ذہن کے اندر کبھی جھانک کر ہی نہیں دیکھا کہ اس کے اندر ہے کیا! اس کا علمی پس منظر کیا ہے؟ ان کے نظریات اور اعتقادات کیا ہیں؟ یہ حقیقت میں ہم نے سمجھا ہی نہیں' جو کہ افسوس ناک ہے۔ میں نے آج سے بارہ تیرہ سال قبل جب ہندوستان کا آخری دورہ کیا تھا تو میں لکھنؤ بھی گیا اور پھر رائے بریلی بھی۔ میں نے مولانا علی میاں صاحب سے ملاقات کی اور اُن سے عرض کیا کہ آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں' جو کسی اور عربی مدرسہ کے اساتذہ سے کہوں گا تو وہ اسے سنیں گے بھی نہیں' جبکہ ندوۃ العلماء چونکہ نسبتاً کشادہ ذہن کے حامل لوگوں کا ادارہ سمجھا جاتا ہے لہٰذا میری درخواست کے درجے میں ایک تجویز یہ ہے کہ آپ ''ندوۃ العلماء'' میں سنسکرت کی تعلیم کو لازم کر دیں' تاکہ یہاں سے فارغ التحصیل حضرات سنسکرت کو پڑھ کر ہندو ذہن کو صحیح طور پر سمجھ سکیں' اس کا گہرائی میں مطالعہ کریں اور ان کے ذہن تبدیل کریں۔ قبل ازیں ہندوستان میں نچلے طبقات مثلاً اچھوتوں وغیرہ کے اندر ایک تبدیلی لائی گئی تھی۔ جب سعودی عرب وغیرہ سے کچھ مالی امداد آنی شروع ہوئی تھی تو پسماندہ' دبے ہوئے اور پسے ہوئے طبقات' جن کی معاشرے میں کوئی حیثیت اور عزت نہیں تھی' ان کی کچھ مالی امداد کی گئی اور ان کے لئے زندگی گزارنے کے بہتر مواقع پیدا کئے گئے تو کچھ ہریجن' شودر قسم کے لوگ مسلمان ہو

گئے۔لیکن اس پر پورے ہندوستان کے اندر بڑا شدید ردعمل ہوا تھا کہ کہاں سے پیسہ آ رہا ہے! اس کے بعد اس کا راستہ روک دیا گیا۔تو اس پہلو سے میں نے کہا تھا کہ اب تو higher elite طبقہ کو خطاب کرنا چاہئے۔اسلام کی تبلیغ کا اصول یہ نہیں ہے کہ کسی معاشرے میں داخل ہونے کے لئے وہاں کے پسماندہ لوگوں کو جمع کر لیا جائے' ان کے ذہن کو بدلا جائے یا ان کا عقیدہ بدل دیا جائے اور بس۔ یہ عیسائی مشنریوں کا طریق تبلیغ ہے' کیونکہ عیسائیت میں تو عقیدے کے سوا کچھ ہے ہی نہیں' جبکہ اسلام میں یہ ''بیک ڈور انٹری'' نہیں ہے' بلکہ ''فرنٹ ڈور انٹری'' ہے کہ پہلے چوٹی کے لوگوں کو مخاطب کرو۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہا گیا تھا: ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى﴾ کہ اے موسیٰ فرعون کے پاس جاؤ کہ وہ طغیانی پر اتر آیا ہے۔حضور ﷺ بھی طائف گئے تو تینوں سرداروں سے ملے' وہاں آپ ﷺ نے street preaching نہیں کی۔تو اس اعتبار سے اسلام کا مزاج کچھ اور ہے۔اس پر مولانا علی میاں صاحب کہنے لگے' ہاں آپ نے واقعی بہت اچھی بات کہی ہے۔ پھر دو سال بعد شکاگو' امریکہ میں میری ان سے ملاقات ہوئی۔ وہ بھی ایک کانفرنس میں مدعو تھے اور میں بھی۔ میں نے وہاں ان سے اس بارے میں دریافت کیا تو کہنے لگے میں تو بھول ہی گیا! تو یہ ہمارے علماء کا حال ہے! مولانا علی میاں تو چوٹی کے عالم تھے۔ انہیں آپ سب سے زیادہ روشن خیال کہہ سکتے ہیں اور وہ سب سے زیادہ دنیا میں گھومے پھرے ہوئے ہیں' پھر بھی انہوں نے اس بات کی اہمیت کو نہیں سمجھا۔لیکن اب کچھ ادارے اس پہلو سے کام کر رہے ہیں' جن میں سے ایک یہ ''آئی آر ایف'' ہے جس کا میں نے آپ کے سامنے تعارف کرانا ضروری سمجھا ہے۔تو اسلام کے حوالے سے یہ ایک بہت بڑا بریک تھرو ہو رہا ہے۔

ہندوؤں میں تبلیغ اسلام

تیسری بات یہ ہے کہ اب ہندوستان کے بہت سے حصوں میں ہندوؤں کو براہ راست تبلیغ کی جا رہی ہے۔اس ضمن میں سب سے بڑی اور اہم بات یہ ہے کہ اب کوئی

resentment نہیں ہے۔ پہلے تو ایک ہندو مسلمان ہو جاتا تھا تو طوفان کھڑا ہو جاتا تھا' مقدمہ بازی شروع ہو جاتی تھی' مسلمانوں کو مارا جاتا تھا' لیکن اب کوئی ردعمل نہیں' اور اچھی بھلی سطح کے لوگ بھی اسلام لا رہے ہیں۔ گویا کہ اب انہوں نے اس بات کو ذہنی طور پر قبول کر لیا ہے کہ مذہب ہر شخص کا انفرادی معاملہ ہے' اور اس پہلو سے میرے نزدیک یہ ایک بہت بڑی تبدیلی ہے۔ ہندوستان میں ایسے کئی ادارے موجود ہیں جو ہندوؤں کو براہِ راست تبلیغ کر رہے ہیں۔ شمس نوید عثمانی نامی ایک شخصیت تھی جن کی ''گر اَب بھی نہ جاگے تو'' کے نام سے ایک بڑی اچھی کتاب منظر عام پر آئی تھی۔ اب وہ خود تو فوت ہو چکے ہیں البتہ ڈاکٹر عبداللہ طارق صاحب جو گویا ان کے خلیفہ ہیں' وہ ہندوؤں میں بڑے پیمانے پر تبلیغ کا کام کر رہے ہیں اور تعلیم یافتہ لوگ اسلام لا رہے ہیں۔ اسی طرح حیدر آباد دکن سے ہمارے ایک پرانے ساتھی عبداللہ صدیقی صاحب نے آندھرا پردیش کے ساحل کا جائزہ لیا کہ جہاں مسلمانوں کے گاؤں کے گاؤں ہندو ہو گئے تھے۔ ویسے بھی اُن میں سے کسی ایک کو بھی کلمہ تک نہیں آتا تھا۔ وہاں کے مسلمانوں میں انہوں نے ایک تحریک شروع کی اور وہاں جا کر مسجدیں تعمیر کیں' مدرسے قائم کئے۔ انہوں نے حیدر آباد میں ایک مرکزی مدرسہ قائم کیا اور وہاں سے لڑکوں کو لا کر یہاں داخل کیا اور ان کے قیام و طعام کا بندوبست کیا۔ اس مدرسے کا میں نے بھی معائنہ کیا ہے اور میں اس سے متعلق ایک روداد کی طرز کا مضمون لے کر آیا ہوں۔ تو یہ بھی ایک کام ہے جو ہو رہا ہے۔ اسی طرح ہندوؤں کے اندر مختلف جگہوں پر مختلف اعتبارات سے کام ہو رہا ہے۔

سیکولرازم کا مثبت اور منفی پہلو

اس ضمن میں سب سے بڑی اور اہم بات جو میرے لئے حیرت ناک ہے' وہ یہ ہے کہ ہندوؤں میں تبلیغ اسلام کا جو کام ہو رہا ہے اس کا کوئی ردّعمل نہیں ہے۔ یہ کام آندھرا پردیش میں بھی ہو رہا ہے' حالانکہ مہاراشٹر اور آندھرا پردیش درحقیقت آر ایس ایس اور بی جے پی کے سب سے بڑے گڑھ ہیں۔ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ

ہندوستان میں سیکولرازم نے واقعتاً جڑیں پکڑ لی ہیں۔اس سے پہلے تک وہاں سیکولرازم اصولی طور پر' دستوری طور پر اور قانونی طور پر تھا' لیکن ذہنوں میں نہیں بیٹھا تھا۔ ہمارے نزدیک سیکولرازم کفر ہے لیکن اس کا یہ ایک مثبت پہلو ہے۔ میں اب بھی اپنی ہر تقریر میں ڈٹ کر کہہ کر آیا ہوں کہ سیکولرازم کفر وشرک ہے' عوامی حاکمیت کا تصور کفر و شرک ہے' اور میں نے وہاں یہ بھی کہا ہے کہ بھارت کے مسلمانوں پر بھی فرض ہے کہ یہاں پر اقامت دین کی جدوجہد کریں۔ اگر آپ اقلیت اور اکثریت کی بات کرتے ہیں تو میں آپ کے سامنے حضورﷺ کی مثال پیش کرتا ہوں۔ آپؐ نے جب کام شروع کیا تو اکیلے تھے۔ اگر آپ کی محنت سے بظاہر کوئی نتیجہ نہ نکلے تو کوئی پروا نہیں' آپ کی اصل ذمہ داری تو یہ ہے کہ آپ کام کریں' اس کی مزدوری آپ کو آخرت میں ملے گی۔ دنیا میں نتیجہ نکلتا ہے یا نہیں نکلتا لیکن کام آپ کو بہرحال وہی کرنا چاہئے۔ میں نے یہ ڈنکے کی چوٹ کہا ہے اور مسلسل کہا ہے' لیکن اس کے اوپر کوئی گرفت نہیں ہوئی' حکومت کی طرف سے کوئی ڈانٹ نہیں آئی۔ ہاں ایک ڈانٹ آئی تھی اور وہ بڑا دلچسپ واقعہ ہے۔

ممبئی میں جب میری پانچ چھ دن کی تقریریں ہو چکی تھیں تو پولیس کمشنر کا ذاکر نائیک صاحب کو فون آیا کہ آپ بھی آئیں اور ڈاکٹر اسرار صاحب کو بھی لے کر آئیں۔ ہم وہاں پہنچے تو اس نے میرا پاسپورٹ لیا اور دیکھ کر کہا کہ اس میں تو کہیں نہیں لکھا کہ آپ یہاں پر تقریریں کریں گے! یہ تو visit ویزا ہے اور اس ویزے میں آپ کو تقریر کرنے کی اجازت نہیں ہے! اب ان سے کہا گیا کہ صاحب ہم نے ویزے کی جو درخواست دی تھی اس میں ہم نے یہ سب لکھا تھا۔ اس درخواست کی کاپی ذاکر نائیک صاحب کے پاس موجود تھی' جو انہوں نے فوراً نکال کر کمشنر کو دے دی۔ اب کمشنر نے کہا کہ ہاں لکھا تو ہے لیکن صرف لیکچرز لکھا ہے' مذہبی لیکچرز تو نہیں لکھا ہے۔ وہ دراصل مجھے فوری طور پر گرفتار کر کے de-port کرنے پر تلا ہوا تھا اور اس کے لئے بنیاد تلاش کر رہا تھا۔ اب راز یہ کھلا کہ کچھ بریلوی مولویوں نے شکایت کی تھی' اس میں حکومت کا ہاتھ

نہیں تھا۔اس موقع پر مجھے اندازہ ہوا کہ عبدالکریم نائیک اور ذاکر نائیک کے کتنے روابط ہیں! ذاکر نائیک یہ سنتے ہی اپنا موبائل فون لے کر باہر چلے گئے اور عبدالکریم نائیک صاحب کمشنر سے بحث کرتے رہے اور خوب جھگڑتے رہے۔ وہ بھی ان کی عزت کر رہا تھا۔ذاکر نائیک صاحب نے وہاں سے فون کے ذریعے صوبائی اور مرکزی وزراء سے رابطے کرنے شروع کئے تو اُسی وقت کمشنر کو فون پر فون آنے شروع ہو گئے۔ چنانچہ اس نے مجھ سے کہا' اچھا ڈاکٹر صاحب آپ تو جایئے اور آرام کیجئے۔ پھر تھوڑی دیر بعد انہوں نے پاسپورٹ بھی واپس کر دیا اور ذاکر نائیک سے کہا کہ خدا کے لئے اب کوئی اور فون مجھے نہ کروائیں۔اس حادثے کے علاوہ کوئی اور ناخوشگوار صورت حال وہاں پر پیش نہیں آئی کہ حکومت یا عوام کی طرف سے کوئی ناگواری کا مظاہرہ ہوا ہو۔

دراصل سیکولرازم کو انہوں نے ذہنی طور پر قبول کر لیا ہے۔سیکولرازم ہمارے نقطۂ نگاہ سے کفر ہے' لیکن اس کا ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ تمام مذاہب برابری کی سطح پر آ جاتے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ ایک بڑا دائرہ ہے' اس دائرے کے اندر کسی ملک کا سیاسی' معاشی اور معاشرتی نظام ہے اور اس کا کسی مذہب سے کوئی تعلق نہیں' البتہ اس دائرے کے پورے محیط کے ساتھ ساتھ جو چھوٹے چھوٹے دائرے بنے ہوئے ہیں یہ مذہب کے دائرے ہیں اور ان کو مساوی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ جب بش یہ کہتا ہے کہ ''ہم اسلام کے خلاف نہیں ہیں'' تو وہ اسلام کو بطور ایک مذہب کے لیتا ہے اور اس سے ان کی واقعتاً کوئی دشمنی نہیں ہے۔ وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہودیوں کے عبادت خانے بھی تم نے خرید لئے اور اب ہم عیسائیوں کے بھی خرید لئے ہیں اور مسجدیں بنالی ہیں تو ہم نے کوئی اعتراض کیا؟ تم نمازیں پڑھتے ہو' اسلامک سنٹرز بناتے ہو' روزے رکھتے ہو' ہم نے کوئی اعتراض کیا؟ ہم تو رمضان میں وائٹ ہاؤس کے اندر ایک افطاری بھی دے دیتے ہیں' عید الفطر اور عید الاضحیٰ پر خاص یادگاری ٹکٹ بھی جاری کر دیتے ہیں۔ تو اسلام بطور مذہب سے تو ان کا جھگڑا نہیں ہے! البتہ ان کا سرکاری مذہب چونکہ عیسائیت ہے لہٰذا وہاں کرسمس کی چھٹیاں ہوتی ہیں' ہماری عیدین کی نہیں ہوتیں۔ اگر تمام مذاہب

کے تہواروں کی چھٹیاں دینی شروع کر دیں تو پھر ورکنگ ڈے کون سا رہ جائے گا! پھر تو ہولی بھی آئے گی' دیوالی بھی آئے گی' مسلمانوں کی عید میلاد النبیؐ سمیت ساری عیدیں آئیں گی۔ تو ان کا مذہب سے بس اتنا سروکار ہے' اس سے زیادہ نہیں۔ یہ اس سیکولرازم کا مثبت پہلو ہے جو اَب ہندوستان میں جڑوں کے اندر گہرا اتر گیا ہے۔

ایک خوش آئند بات اور بھی ہے کہ اب سابقہ تلخیاں رفتہ رفتہ ختم ہوتی جا رہی ہیں۔ آزادی کے بعد تقریباً دو نسلیں بیت چکی ہیں۔ پچھلی تاریخ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین جو تلخیاں تھیں' اور پھر خاص طور پر انگریز نے ''divide and rule'' کی پالیسی کے تحت جو جلتی پر تیل ڈالا تھا' وہ چیزیں اب رفتہ رفتہ ختم ہو گئیں اور وہ نسلیں بھی بیت چکی ہیں۔ اس پہلو سے بھی اس معاملے کے اندر ایک بہتری کی صورت حال پیدا ہوئی ہے اور اسی کے نتیجے میں مَیں یہ سمجھ رہا ہوں کہ بی جے پی اور آر ایس ایس دونوں کا زوال شروع ہو چکا ہے۔ اب میری رائے میں بی جے پی بھارت میں دوبارہ کسی سیاسی حیثیت میں سامنے نہیں آ سکتی۔ سیاسی میدان کے اندر ان کا جو بھی عروج آنا تھا' وہ آ چکا۔

قانون کی عملداری

ایک اور چیز جو میں نے وہاں نوٹ کی ہے وہ یہ ہے کہ قانون کی عملداری کے معاملے میں بہت سختی ہے۔ جیسے میں نے مثال دی کہ رات دس بجے کے بعد کوئی لاؤڈ سپیکر کہیں بھی استعمال نہیں ہو سکتا' لہٰذا کہیں کوئی جلسہ نہیں ہوتا' کوئی تقریب نہیں ہوتی۔ قانون کی پاسداری کا معاملہ تو یہاں تک ہے کہ ان کے جو چار چوٹی کے مذہبی راہنما ہیں' جو ''شنکر اچاریہ'' کہلاتے ہیں' ان میں سے مدراس کا مذہبی رہنما ایک مقدمۂ قتل کے اندر ملوث ہو گیا۔ اس کے آشرم کے اکاؤنٹینٹ نے کہیں اس کے غبن وغیرہ کا راز فاش کیا تو اس نے اکاؤنٹینٹ کو قتل کرا دیا۔ چنانچہ اس پر قتل کا مقدمہ بنا اور اتنے بڑے مذہبی لیڈر کو بالکل عام مجرموں کی طرح گرفتار کر کے پولیس وین میں لے جایا گیا۔ اس پر پورے ہندوستان کے اندر احتجاج بھی ہوا کہ اتنی بڑی شخصیت کے ساتھ اس طرح کا

سلوک تو نہیں کرنا چاہئے۔ پولیس کو اُس کا ریمانڈ دیا گیا اور جب تک پولیس چھان بین کرتی رہی وہ راہنما حراست میں رہا۔ اس اعتبار سے وہاں پر اعلیٰ و ادنیٰ میں کوئی فرق نہیں' اگرچہ سیاست میں اوپر کے لوگوں میں بدعنوانیاں وہاں بھی ویسی ہیں جیسی ہمارے ہاں ہیں۔ بے ایمانیاں' اسکینڈلز' غبن وغیرہ وہاں بھی ہوتے ہیں' لیکن جو پکڑ میں آ گیا اس کا پھر پورا حساب کتاب ہوتا ہے۔ البتہ قابل تعریف امر یہ ہے کہ وہاں پر سیاست عوامی ہے' عوام کا ووٹ ہی فیصلہ کرتا ہے اور اس کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اپوزیشن انتخابات کے بعد دھاندلی کے الزامات عائد کرے۔ وہاں پر شفاف قسم کے انتخابات ہوتے ہیں۔ اب تو چونکہ ان کے کمپیوٹرائزڈ الیکشن ہو رہے ہیں لہٰذا اب کسی کے لئے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں رہا۔

وہاں پر انہوں نے آزادی کے بعد پہلا مثبت قدم یہ اٹھایا کہ جاگیرداری ختم کر دی گئی' جبکہ ہمارے ہاں وہ لعنت ابھی تک چل رہی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جاگیرداروں نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیا ہی اس لئے تھا کہ ہماری جاگیروں کو حفاظت حاصل ہو جائے گی' اور وہ حاصل ہو گئی۔ ہماری سیاست تو بس جاگیرداروں کی میوزیکل چیئر گیم ہے۔ عوام کا عمل دخل بس کچھ شہروں کی حد تک ہوتا ہے۔ کراچی کے اندر کبھی جماعت اسلامی کی لہر آ گئی تھی' پھر ایم کیو ایم کی لہر آئی تو اس نے جماعت اسلامی کا صفایا کر دیا۔ تو اس طرح عوامی لہر کوئی آ سکتی ہے تو صرف شہروں کے اندر جبکہ ہماری ستر فیصد آبادی دیہی ہے۔ وہاں جو بڑا زمیندار بیٹھا ہوا ہے اس کی مرضی کے خلاف کون ووٹ دے سکتا ہے؟ اگر دے گا تو وہاں رہے گا کیسے؟ اور اس کی بھینس اور اس کا بچھڑا کیا بچا رہے گا؟ وہ تو فوراً چوری ہو جائے گا اور کہیں کوئی دادرسی نہ ہو گی۔ تو اس حوالے سے بھارت کی عوامی سیاست ان کی گویا ایک achievement ہے۔

میں نے ایک مشاہدہ اور کیا ہے' جسے سن کر شاید آپ بھی حیران ہوں' کہ میں نے ممبئی میں مسلمان خواتین اور لڑکیوں کو پورے پردے اور نقاب کے ساتھ موٹر سائیکل اور سکوٹر چلاتے دیکھا ہے۔ ہمارے ہاں خواتین کار ڈرائیونگ تو کرتی ہیں' اور کہیں

کہیں کوئی باپردہ خاتون باقاعدہ نقاب کے ساتھ بھی کار ڈرائیو کرتی ہوئی نظر آ جاتی ہے' اس لئے کہ کار میں تو ایک طرح کی چار دیواری اور پردہ ہوتا ہے' لیکن پاکستان میں آج تک میں نے کسی لڑکی یا کسی عورت کو موٹر سائیکل یا سکوٹر چلاتے ہوئے نہیں دیکھا۔

دعوت رجوع الی القرآن کی پذیرائی

اب اصل بات مجھے یہ کہنی ہے کہ بھارت میں میری جو پذیرائی ہوئی ہے اور میرے جلسوں میں جس طرح ہجوم ٹوٹ کر گرا ہے' ہر سطح کے لوگوں کی طرف سے میرے ساتھ جس عقیدت کا اظہار ہوا ہے' بڑے بڑے پروفیسروں اور مصنفوں نے اپنی کتابوں کا ہدیہ پیش کیا ہے' بڑی بڑی ٹرافیاں اور تحفے تحائف پیش کئے گئے ہیں' جگہ جگہ جو استقبالیے ہوئے ہیں' قرآن مجید کی طرف رجوع کا یہ منظر جو میں دیکھ رہا ہوں' یہ میرے نزدیک بہت دوررس نتائج کا حامل ہے۔ بھارت میں اس وقت صورت حال یہ ہے کہ سیاسی اور مذہبی اعتبار سے علماء کا اثر و رسوخ نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے۔ عام تعلیم یافتہ نوجوان علماء سے بیزار ہیں۔ اس بیزاری کی وجہ یہ بھی ہے کہ ان کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں اور یہ بھی کہ علماء میں سے اکثر و بیشتر کا کردار صحیح نہیں ہے۔ خاص طور پر جو علماء سیاست میں ہیں وہ حکومت کے ساتھ معاملہ کر کے مفادات حاصل کرتے ہیں اور پھر حکومت کی ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں۔ اس اعتبار سے علماء کی حیثیت وہاں بہت کمزور ہو چکی ہے۔ دہلی میں اب کوئی بڑی علمی شخصیت یا کوئی بڑا عالم دین موجود نہیں ہے جس کی طرف لوگ رجوع کر سکیں۔ اس اعتبار سے دہلی خالی پڑی ہوئی ہے۔ ہاں حیدر آباد میں مولانا حسام الدین عاقل صاحب ہیں' ان کی ایک حیثیت ہے' ان کا مدرسہ بھی بہت بڑا ہے۔ وہ لاہور بھی آئے تھے اور یہاں مجھ سے ملاقات بھی کی تھی۔ عام طور پر سیاست میں علماء کا رول ختم ہو چکا ہے۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ جو کانگریس کے بہت بڑے محسن تھے' ان کے بیٹے اسد مدنی کو حکومت نے کچھ نہ کچھ مقام دیئے رکھا اور جب تک کانگریس کی حکومت رہی راجیہ سبھا (سینٹ) میں ہمیشہ ان کی سیٹ رہی' لیکن اب ان کے پاس یہ سیٹ بھی نہیں ہے۔ اس اعتبار سے اب وہاں ایک

بہت بڑا خلا ہے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ مشیت الٰہی سے یہ جو Qtv پر میرا درسِ قرآن کا پروگرام آیا ہے اس نے اصولی اور علمی اعتبار سے اس خلا کو پُر کیا ہے۔ اسی لئے اب وہاں کے مسلمان والہانہ انداز میں اس کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ یہ پروگرام تو پوری دنیا کے مسلمان دیکھ رہے ہیں اور امریکہ والے شکایت کر رہے ہیں کہ یہ صرف صبح سات سے آٹھ بجے تک دکھایا جاتا ہے اور یہ وقت ہمارے اعتبار سے موزوں نہیں' لہٰذا یہ شام کو بھی repeat ہونا چاہئے۔

پاکستان میں میرے دروسِ قرآن کا آغاز اگرچہ اسلامی جمعیت طلبہ کے دور سے ہو گیا تھا' لیکن میری دعوت رجوع الی القرآن کا آغاز ۱۹۶۵ء میں ہوا۔ اتوار کی صبح مسجد خضراء میں میرا درس قرآن ہوتا تھا جس میں تین ساڑھے تین سو افراد کی حاضری ہوتی۔ میرا یہ سلسلہ وار درس قرآن شہر کے وسط میں مسجد شہداء میں منتقل ہوا تو وہاں چھ سو' سات سو' آٹھ سو تک حاضری ہونے لگی۔ اس کے بعد فاران کلب کراچی کے اندر میرا ماہانہ درسِ قرآن شروع ہوا تو وہاں ایک ہزار کے قریب مرد اور پانچ سو کے قریب عورتیں اس میں شریک ہوتی رہیں۔ پاکستان میں یہ زیادہ سے زیادہ حاضری ہے جو میرے دروس میں رہی۔ لیکن ہندوستان میں' جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا' میرے دروس و خطابات میں دس دس ہزار مرد اور پانچ پانچ ہزار عورتیں شریک ہوئیں۔ اسی سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہاں یہ دعوت رجوع الی القرآن کس قدر مقبولیت حاصل کر رہی ہے۔

وہاں مجھے جو پذیرائی حاصل ہوئی' ایک داعی الی القرآن کی حیثیت سے حاصل ہوئی۔ اور تو میرا کوئی مقام نہیں۔ نہ میں کوئی صوفی ہوں' نہ مرشد ہوں' نہ کوئی ولی اللہ ہوں' نہ کسی سلسلے سے وابستہ ہوں' نہ کسی دارالعلوم سے میری وابستگی ہے' نہ جمعیت علماء دیوبند سے میرا کوئی تعلق ہے' نہ جمعیت علماء بریلوی یا جمعیت اہلحدیث سے کوئی تعلق ہے۔ میں صرف قرآن کا ایک طالب علم ہوں' جس نے جو کچھ سمجھا ہے وہ سمجھانے کی کوشش بھی کی ہے۔ اقبال نے کہا تھا ع ''میں نہ عارف' نہ محدث' نہ مجدّد' نہ فقیہہ''۔

میں کہا کرتا ہوں کہ شکر ہے اس نے مفسر ہونے کی نفی نہیں کی' میں اس کو مفسرِ قرآن سمجھتا ہوں۔ اقبال عارف بھی تھا' مفسر بھی تھا اور میرے نزدیک وہ فکر اسلامی کا مجدّد بھی تھا۔ لیکن میری تو کوئی بھی حیثیت نہیں۔ میں نے کھل کر بیان کیا ہے کہ میں نے کن چار گوشوں سے خوشہ چینی کی ہے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ''دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر'' کے حصہ دوم کا بابِ چہارم)۔ ہاں' ان عناصر اربعہ کو میں نے جوڑا ہے اور ان کے اندر ایک منطقی ربط قائم کیا ہے' اس لئے کہ اللہ نے مجھے ذہن منطقی دیا تھا۔ میں نے کبھی منطق نہیں پڑھی' نہ جدید نہ قدیم' لیکن میرا ذہن منطقی ہے' اس میں ایک سیدھی لائن میں سوچنے کی صلاحیت اور استعداد ہے۔ میرے فکر کے عناصر اربعہ یہ ہیں: (i) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور ان سے اوپر مولانا ابوالکلام آزاد' (ii) ڈاکٹر رفیع الدین اور ان سے اوپر ڈاکٹر علامہ اقبال' (iii) مولانا امین احسن اصلاحی اور ان سے اوپر مولانا وحید الدین فراہی' (iv) شیخ الہند مولانا محمود حسن اور شیخ الاسلام (پاکستان کے پہلے اور آخری شیخ الاسلام) علامہ شبیر احمد عثمانی۔ تو میں نے ان آٹھ اشخاص سے خوشہ چینی کی ہے۔ البتہ اس میں ایک تو اضافہ ہوا میرے سائنٹیفک بیک گراؤنڈ کا' کہ میں نے ایم بی بی ایس کیا اور سائنس کی مبادیات سے واقف ہوں۔ دوسرے یہ کہ میرا ذہن منطقی ہے۔ اس کے علاوہ میری کوئی حیثیت نہیں ہے۔ تو یہ جو والہانہ انداز دیکھنے میں آیا ہے تو یہ دراصل اہل بھارت کا قرآن کی طرف رجوع ہے۔

قرآن حکیم کی قوتِ تسخیر

آج سے ٹھیک پندرہ سال پہلے اسی آڈیٹوریم میں' جب کہ اس کی یہ چھت ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی' انجمن خدام القرآن کا سالانہ اجلاس تھا۔ اس زمانے میں پاکستان اور ہندوستان کے حالات بہت کشیدہ جا رہے تھے۔ ہم ابھی ایٹمی طاقت نہیں بنے تھے' جبکہ بھارت ۱۹۷۴ء سے ایٹمی طاقت بن چکا تھا۔ حالات کی سنگینی کے پیش نظر اس بات کا اندیشہ تھا کہ کہیں بھارت جارحیت کر کے پاکستان کو ختم نہ کر دے اور اس کے حصے بخرے نہ کر دے۔ ان حالات میں مَیں نے سالانہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے یہ

کہا تھا کہ اگر بالفرض خدانخواستہ بھارت نے پاکستان کو فتح کر لیا تو ہم اِن شاء اللہ اسے قرآن کے ذریعے سے فتح کریں گے۔ تاتاریوں نے مسلمان ممالک کو فتح کیا تھا اور کروڑوں مسلمانوں کو قتل کیا تھا' لیکن پھر اسلام نے انہیں فتح کر لیا۔ اُس وقت اگر بھارت پاکستان پر حملہ کرتا تو ہم کروڑوں کی تعداد میں قتل ہوتے۔ اُس وقت ہندو مسلم دشمنی عروج پر تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں ''ہندُتوا'' کی ایک لہر اُٹھی تھی۔ بی جے پی بڑے خوفناک انداز میں آگے آ رہی تھی۔ تاتاریوں کو جس اسلام نے فتح کیا' وہ اسلام کون سا تھا؟ وہ صوفیاء والا اسلام تھا' قرآن والا اسلام نہیں تھا۔ اُس وقت دنیا میں نہ تو کہیں قرآن کا نظام قائم تھا اور نہ ہی قرآن کی طرف لوگوں کی توجہ تھی' لیکن اُس وقت کے صوفیائے کرام کی بے نفسی' نیک نیتی' انسان دوستی' خلوص اور ان کے تواضع اور حلم نے تاتاریوں جیسی وحشی قوم کو فتح کر لیا۔ گویا انہوں نے درندوں کو فتح کیا۔ میں نے یہ کہا تھا کہ ہم اپنی قرآنی تحریک جو لے کر چل رہے ہیں' اللہ تعالیٰ ہمیں اس پر استقامت عطا فرمائے اور ہمیں اس کو آگے لے جانے کی توفیق دے' یہ تحریک اتنی مؤثر ہو چکی ہے کہ اگر خدانخواستہ کبھی ہندوستان نے پاکستان فتح کر لیا تو ہم اسے قرآن مجید کے ذریعے سے فتح کر لیں گے۔

اس ضمن میں مجھے اقبال کے دو شعر یاد آ رہے ہیں۔

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است
زانکہ اُو گم اندر اعماقِ دل است
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی
کشتۂ شمشیر قرآنش کنی!

یعنی ابلیس کو قتل کر دینا کوئی آسان کام نہیں ہے' اس لئے کہ وہ تو انسان کے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ (اس شعر میں علامہ اقبال نے اس حدیث نبویؐ کی ترجمانی کی ہے: اِنَّ الشَّیْطَانَ یَجْرِیْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَی الدَّمِ) بہتر یہ ہے کہ اسے مسلمان بناؤ' اور قرآن کی شمشیر سے اس کا قلع قمع کرو۔ یہی بات میں نے ۱۹۸۹ء میں اسی جگہ

ہندوستان کے بارے میں کہی تھی۔ اب میں اس کے آثار دیکھ رہا ہوں کہ شاید قرآن ہندو قوم کو فتح کر لے۔ اسی اعتبار سے آج میں نے آغازِ کلام میں سورۃ الانعام کی آیت ۸۹ کا آخری ٹکڑا تلاوت کیا تھا:

﴿فَاِنۡ یَّکۡفُرۡ بِہَا ہٰۤؤُلَآءِ فَقَدۡ وَکَّلۡنَا بِہَا قَوۡمًا لَّیۡسُوۡا بِہَا بِکٰفِرِیۡنَ﴾ (الانعام)

یعنی اے نبیؐ! اگر اہل مکہ اس قرآن کی ناقدری کر رہے ہیں‘ ناشکری کر رہے ہیں‘ اس کی قدر نہیں کر رہے‘ اس کی دعوت کو قبول نہیں کر رہے‘ تو ہم نے اس کام کو ایک اور قوم کے حوالے کیا ہوا ہے جو اِس کی ناقدری نہیں کرے گی۔ اس سے مراد اہل مدینہ ہیں۔ مکہ میں حضورﷺ کی تیرہ برس کی دعوت کا وہ نتیجہ نہیں نکلا جو مدینہ میں آپﷺ کے ساتھیوں مصعب بن عمیر اور عبداللہ بن اُم مکتوم رضی اللہ عنہما کی دعوت کا دو سال کے اندر نکل آیا جبکہ حضورﷺ کے قدم مبارک ابھی وہاں پہنچے بھی نہیں۔ گویا وہاں کی زمین اس دعوت کو قبول کرنے کے لئے تیار تھی‘ منتظر تھی‘ چشم براہ تھی۔ قرآن حکیم کی قوتِ تسخیر سے ہندوستان کو فتح کرنے کی جو بات میں نے آج سے پندرہ سال قبل کی تھی‘ اپنے اس خیال کا مشاہدہ اب میں اپنی آنکھوں سے کر کے آیا ہوں۔

دوسرے یہ کہ اس ضمن میں مَیں نے دو مرتبہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا ایک اقتباس شائع کیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کو میں بارہویں صدی ہجری کا مجدّدِ اعظم سمجھتا ہوں۔ ان کی ایک کتاب ’’تفہیماتِ الٰہیہ‘‘ کا ایک اقتباس ’’دارالعلوم‘‘ نامی رسالے کے سرورق پر چھپا تھا جو دارالعلوم دیوبند سے نکلتا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا تھا کہ ایک وقت آئے گا کہ ہندوستان کے اونچی ذات کے ہندوؤں کی اکثریت اسلام قبول کر لے گی۔ اسی وقت میرا ماتھا ٹھنکا تھا کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے یہاں تبلیغ کی ہوتی اور شودروں کی ذرا سی بھی دلجوئی ہوتی تو ہندوستان کے نچلی ذات کے تمام لوگ ایمان لے آتے‘ یہ اسلام کا طریقہ تبلیغ نہیں ہے۔ جب تک معاشرے کی ایلیٹ یعنی اوپر کے طبقہ کے لوگوں کو خطاب نہ کیا جائے‘ دعوت و تبلیغ مؤثر نہیں ہوتی۔ تو شاہ صاحبؒ کا یہ کہنا کہ ایک وقت آئے گا کہ ہندوستان

کے اونچی ذات کے ہندوؤں کی اکثریت اسلام قبول کر لے گی' مجھے اس پیشین گوئی کا بھی' چاہے ہزار میں ایک درجے میں سہی' آغاز ہوتا نظر آ رہا ہے۔

اُمت مسلمہ کی نشاۃِ ثالثہ کی سرزمین؟

شمس نوید عثمانی صاحب نے اپنی کتاب ''گر اب بھی نہ جاگے تو.....'' میں اپنا یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اب اُمت مسلمہ کی نشاۃِ ثالثہ ان شاء اللہ ہندوستان سے ہوگی۔ یہ ''نشاۃِ ثالثہ'' کا لفظ میں نے استعمال کیا ہے۔ دیکھئے اسلام کی تو اَب نشاۃِ ثانیہ ہونی ہے۔ اسلام کی نشاۃِ اولیٰ کا زمانہ دورِ نبویؐ اور دورِ خلافتِ راشدہ تھا۔ اس کے بعد اس کا زوال شروع ہوا اور گرتے گرتے یہ آج زمین سے لگا ہوا ہے۔ البتہ اب یہ دوبارہ اٹھے گا اور یہ اس کی نشاۃ ثانیہ ہوگی۔ لیکن مسلمان بحیثیت اُمت دو مرتبہ عروج اور دو مرتبہ زوال سے دوچار ہو چکے ہیں۔ ایک مرتبہ خلافت راشدہ کے بعد بنواُمیہ اور بنوعباس کے دور میں مسلمانوں کی بڑی عظیم حکومتیں قائم ہوئیں' لیکن یہ اسلامی حکومتیں نہیں تھیں۔ پھر ان حکومتوں کو زوال آیا' عربوں سے اُمت مسلمہ کی قیادت چھین لی گئی اور اس کے بعد ترکوں کے ہاتھ میں جھنڈا دے دیا گیا۔ یہ اُمت مسلمہ کی نشاۃِ ثانیہ تھی۔ اُس دور میں ترکانِ تیموری' ترکانِ صفوی اور ترکانِ عثمانی نے عظیم حکومتیں قائم کیں۔ ترکانِ عثمانی نے عظیم سلطنت عثمانیہ قائم کی اور چار سو برس تک خلافت ان کے پاس رہی۔ پھر ان کا بھی زوال آیا اور ترکی نے مردِ بیمار کی حیثیت اختیار کر لی۔ اب گویا اُمت کی نشاۃِ ثالثہ ہونی ہے۔ شمس نوید عثمانی صاحب کا خیال تھا کہ یہ ہندوستان سے ہو گی۔ اور مجھے یہ خیال سٹرائیک کیا تھا۔ اس لئے کہ بھارت' پاکستان اور بنگلہ دیش آخر ایک بڑے ہندوستان ہی کے تو حصے تھے' اور ان کے اندر اب بھی وہی قومیں آباد ہیں جو پہلے آباد تھیں۔ چنانچہ وہی جاٹ اُدھر ہیں' وہی جاٹ اِدھر ہیں۔ راجپوت اُدھر بھی ہیں اور اِدھر بھی۔ بنیے اُدھر ہیں اور ان سے مسلمان ہونے والے شیخ اِدھر ہیں۔ علامہ اقبال برہمن ہیں۔ اور بھی بہت سے برہمن اسلام لائے ہیں۔ تو برعظیم پاک و ہند کے باسی نسلی اعتبار سے ایک ہیں لیکن دین وملت اور مذہب کے اعتبار سے جدا ہیں۔

اصل میں حضرت نوح علیہ السلام کے بعد نسل انسانی اُن کے تین بیٹوں سے چلی ہے۔ آج جو کردستان کا علاقہ ہے یہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا مسکن تھا۔ یہ اس وقت چار ملکوں ایران، عراق، ترکی اور آرمینیا میں تقسیم ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے سام سے سامی (Sametic) نسلیں چلی ہیں جن میں یہودی اور عرب دونوں شامل ہیں۔ یہودیوں کے خلاف ردّعمل Anti-Sametism کہلاتا ہے، حالانکہ عرب بھی سامی النسل ہیں۔ تو پہلے مسلمانوں کی قیادت حضرت سام کی نسل یعنی عربوں کو دی گئی۔ اُن کے زوال کے بعد دوسری مرتبہ جو اُبھار ہوا وہ حضرت یافث کی اولاد میں ہوا۔ ان کی نسل سنٹرل ایشیا کے پہاڑی سلسلے کو عبور کر کے روس کے میدانی علاقے میں آباد ہوئی اور روس سے ہو کر منگولیا اور چائنا تک پھیل گئی۔ دوسری طرف یہ نسل سکینڈے نیوین ممالک تک پھیلتی چلی گئی۔ تورات کے مطابق یاجوج اور ماجوج یافث کے بیٹے ہیں۔ تو حضرت سام کی اولاد جنوب میں اتر کر جزیرہ نمائے عرب میں آباد ہوئی اور حضرت یافث کی اولاد شمال میں جا کر مشرق و مغرب میں پھیل گئی۔ جبکہ حضرت حام کی اولاد (جسے جدید اصطلاح میں آریائی نسل کہا جاتا ہے) ان دونوں علاقوں کے درمیان دائیں بائیں پھیل گئی۔ آریائی نسل میں ایران، ہندوستان اور سوڈان کے باشندے اور بربر قوم شامل ہے۔ یورپ میں جرمن اور رومن قومیں آریائی ہیں۔ باقی فرانس، اٹلی اور انگلستان ناروی نسلیں (Nordic Races) ہیں جو اوپر سے آئے ہیں۔ یہ یافث کی اولاد ہیں۔ یورپ کے شمال میں سکینڈے نیوین ممالک ہیں، جن میں حضرت یافث کی اولاد آباد ہوئی۔ ان ہی میں بہت بڑے بڑے بحری قزاق ہوتے تھے جنہوں نے رود بارِ انگلستان کے اِدھر اور اُدھر انگلستان اور فرانس کو آباد کیا۔ تو یہ دنیا کی نسلی تقسیم ہے۔ اب تیسری مرتبہ مسلمان اُمت کا جو اُبھار آئے گا تو وہ حضرت حام کی نسل سے ہوگا، جس میں ہم پاکستان اور ہندوستان کے لوگ بھی شامل ہیں۔

آغازِ خطاب میں مَیں نے یہ آیت بھی پڑھی تھی:

﴿وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ﴾ (محمد)

''اور اگر تم نے روگردانی کی تو ہم تمہاری جگہ دوسری قوم کو لے آئیں گے' پھر وہ تمہاری طرح کے نہیں ہوں گے۔''

اس میں ہمارے لئے ایک بڑی وعید ہے کہ ہمیں اللہ نے جو موقع دیا تھا ہم نے اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت نہیں کیا۔ کیا عجب اللہ تعالیٰ ہماری جگہ ہندوستان کے لوگوں کو یہ توفیق دے دے کہ وہ اس کے دین کے علمبردار بن جائیں۔ وہاں کا مسلمان ہم سے زیادہ مذہبی ہے۔ ان کے صرف ایلیٹ طبقہ کے اندر یورپی تہذیب آ گئی ہے' اور یہ طبقہ بہت ہی کم ہے۔ باقی اُن کے ہاں پردہ جتنا ہے ہم تصور نہیں کر سکتے۔ ان کے ہاں مذہبی دینداری ہم سے زیادہ ہے۔ مدارس اور دارالعلوموں کے معاملے میں بھی وہ ہم سے بہت بہتر ہیں۔ یہاں پیسے کی ریل پیل ہے اور اونچے طبقات زیادہ ہیں۔ اس کے برعکس وہاں پر غربت زیادہ ہے۔ اور یہ بات میں وہاں کہہ کر آیا ہوں کہ اتنی بلندی اور اتنی پستی! ایک طرف بلندی کا یہ عالم ہے کہ بہت ہی کم شرح خواندگی کے باوجود وہ ایک کامیاب جمہوریت چلا کر دکھا رہے ہیں۔ یورپ اور امریکہ والے اسے معجزہ سمجھتے ہیں۔ بھارت کی جمہوریت اُن کے معیار پر پوری اُتر رہی ہے' جبکہ شرحِ خواندگی بہت کم ہے۔ دوسری طرف پستی کا یہ عالم کہ سوشل سکیورٹی کا کوئی پروگرام ہے ہی نہیں۔ گویا غریب کا کوئی حصہ کہیں ہے ہی نہیں۔ دنیا میں سب سے اونچے درجے کی سوشل سکیورٹی سکینڈے نیوین ممالک میں ہے' اس سے کم درجے کی برطانیہ میں' اور سب سے کم درجے کی امریکہ میں۔ لیکن وہاں بھی یہ صورتحال ہے کہ آپ اپنے آپ کو بے روزگار کی حیثیت سے جا کر رجسٹرڈ کرائیں تو آپ کو فوراً ماہانہ پنشن مل جائے گی اور ساتھ ہی رہائش کے لئے ایک کوارٹر کی چابی مل جائے گی۔ بدترین کیپٹلزم کے اندر بھی سوشل سکیورٹی کو یہ اہمیت دی جا رہی ہے' لیکن ہندوستان میں اس کا کوئی تصور سرے سے ہے ہی نہیں۔ تو اس پہلو سے وہاں پر بہت بڑی پستی کا معاملہ بھی ہے۔ خاص طور پر بہار اور بنگال کے صوبوں کے مسلمان انتہائی غربت کا شکار ہیں۔ مشرقی پاکستان سے بھی جو مسلمان غرباء چوری چھپے وہاں پر آتے ہیں انہیں بھی انتہائی کمتر درجے کے روزگار

میسر آتے ہیں۔

بہرحال یہ میرے حالیہ دورۂ بھارت کے مشاہدات اور تاثرات تھے۔ آپ دعا کریں کہ جو تحریک رجوع الی القرآن ہم نے ۱۹۶۵ء سے شروع کی تھی اور جسے اب چالیس سال ہو گئے ہیں' اس کے اندر اور حرکت آئے اور مزید نوجوان آ کر اس کے اندر اپنی صلاحیتیں کھپائیں اور قرآن کی دعوت کو لے کر چہار دانگ عالم میں پھیلائیں۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ اسی سرزمین سے یا اس سے ملحقہ سرزمین سے اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا کام شروع کرا دے۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

ذبح عظیم

عیدالاضحیٰ اور فلسفۂ قربانی

ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ کے خطاب کی تلخیص

از: رؤف اکبر

اُمت مسلمہ ہر سال عیدالاضحیٰ پورے جوش وخروش سے مناتی ہے۔عیدالاضحیٰ کی سب سے اہم اور نمایاں خصوصیت قربانی ہے۔قابل غور بات یہ ہے کہ اس قربانی کا فلسفہ کیا ہے اور یہ کس چیز کی علامت ہے! یہی وہ بات ہے جو خود صحابہ کرام ؓ نے نبی اکرم ﷺ سے پوچھی تھی۔صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تھا کہ: مَا هٰذِهِ الْاَضَاحِیُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ؟ ''اے اللہ کے رسولؐ! ان قربانیوں کی حقیقت کیا ہے؟'' اس کے جواب میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ: ((سُنَّةُ اَبِیْکُمْ اِبْرَاهِیْمَ)) ''یہ تمہارے باپ ابراہیم (علیہ السلام) کی سنت ہے۔وہ سنت کیا ہے جس کی وجہ سے یہ قربانی کی جاتی ہے؟ وہ سنت یہ ہے کہ ایک سو سال کے بوڑھے باپ نے اپنے ربّ کے حکم سے اپنے اکلوتے بیٹے کے گلے پر چھری چلا دی تھی اور اس طرح اپنی محبت واُنس اور اپنے جذبات واحساسات کو اللہ کی رضا کی خاطر قربان کر دیا تھا۔اس طرح یہ قربانی تاریخ انسانی کا عظیم ترین واقعہ بن گئی اور یہ ہمیشہ کے لئے شعائرِ دین میں شامل ہوگئی۔ چنانچہ عیدالاضحیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس عظیم قربانی کی یاد ہے جس کی نظیر تاریخ انسانی پیش کرنے سے قاصر ہے۔

ہمیں اس بات کا جائزہ لینا چاہئے کہ یہ قربانی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی میں کس اہمیت کی حامل ہے اور وہ قربانیوں کا کون سا سلسلہ ہے جس کا نقطۂ عروج یہ عظیم قربانی ہے! لیکن اس سے پہلے اس بات کو جاننا چاہئے کہ انسانی زندگی کا اصل مقصد کیا ہے؟ اس حقیقتِ زندگی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ (الملك:٢)

''اُس ذات (یعنی اللہ تعالیٰ) نے موت وحیات کا یہ سلسلہ اس لئے تخلیق فرمایا

ہے کہ (اس کے ذریعے) تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرتا ہے۔''

اس آزمائش اور جانچ پڑتال کے لئے ربّ کائنات نے دو امتحان مقرر کئے ہیں۔ پہلا امتحان عقل و نظر اور علم و فکر کا ہے' جبکہ دوسرا امتحان ارادے' نیت' سیرت و کردار اور عمل کا ہے۔ اس آزمائش کی کامل اور مکمل جھلک قرآن مجید حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ قرآن میں آتا ہے:

﴿وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ﴾ (البقرۃ:۱۲۴)

''اور یاد کرو کہ جب آزمایا ابراہیمؑ کو اُس کے ربّ نے بڑی بڑی باتوں میں' تو وہ اُن سب میں پورا اُتر گیا۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جو پہلا امتحان لیا گیا اس کا تعلق فکر و نظر اور عقل و شعور کے ساتھ ہے۔ آپؑ ایک ایسے ماحول میں پیدا ہوئے جہاں ہر طرح کا شرک موجود تھا۔ وہاں سیاسی شرک غیر اللہ کی حاکمیت کی صورت میں اور مذہبی شرک ستارہ پرستی کی شکل میں موجود تھا۔ اسی طرح وہاں اصنام پرستی بھی رائج تھی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے غور و فکر کے بعد ان سب معبودانِ باطل کی پرستش سے انکار کر دیا اور ان کے دل کی گہرائیوں سے ابھر کر اِس نعرۂ توحید کی صدا اُن کی زبان سے بلند ہوئی:

﴿اِنِّىْ وَجَّهْتُ وَجْهِىَ لِلَّذِىْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ (الانعام)

''میں نے اپنے رُخ پھیر دیا اُس ذات کی طرف جس نے پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین کو' ہر طرف سے یکسو ہو کر' اور میں ہرگز اُس کے ساتھ شرک کرنے والا نہیں۔''

اور اِس طرح اپنی عقل و فکر کی پہلی آزمائش میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کامیاب ہو جاتے ہیں۔

اس کے بعد ارادہ و عمل اور سیرت و کردار کا امتحان شروع ہوتا ہے' جس میں سب سے پہلی کشمکش اپنے والد سے ہوتی ہے۔ آپ اپنے والد کو دعوتِ توحید دیتے ہیں۔ آپ علیہ السلام کا اپنے والد کے ساتھ یہ مکالمہ سورۂ مریم میں ذکر ہوا ہے۔ آپ بڑی لجاجت

سے اپنے والد سے کہتے ہیں:

﴿یٰۤاَبَتِ لَا تَعۡبُدِ الشَّیۡطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّیۡطٰنَ کَانَ لِلرَّحۡمٰنِ عَصِیًّا ﴿۴۴﴾﴾

''ابا جان! شیطان کی بندگی نہ کیجئے' بلاشبہ شیطان تو رحمان کا نافرمان ہے۔''

لیکن اس عاجزی وانکساری اور ادب واحترام سے دی گئی دعوت کا جواب والد کی جانب سے یوں ملتا ہے:

﴿اَرَاغِبٌ اَنۡتَ عَنۡ اٰلِهَتِیۡ یٰۤاِبۡرٰهِیۡمُ ۚ لَئِنۡ لَّمۡ تَنۡتَهِ لَاَرۡجُمَنَّکَ وَاهۡجُرۡنِیۡ مَلِیًّا ﴿۴۶﴾﴾

''اے ابراہیم! کیا تم میرے معبودوں سے روگردانی کر رہے ہو؟ (ہماری قومی ونسلی روایات کو اپنے پاؤں کے نیچے روند دینا چاہتے ہو؟) اگر تم باز نہ آئے تو میں تمہیں سنگسار کر دوں گا۔ (یہ تو خیر بعد کی بات ہے) اس وقت تم ہمیشہ کے لئے مجھ سے دور ہو جاؤ (اور فوراً میرے گھر سے نکل جاؤ!)''

اس کے جواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کہتے ہیں:

﴿سَلٰمٌ عَلَیۡکَ ۚ سَاَسۡتَغۡفِرُ لَکَ رَبِّیۡ ؕ اِنَّهٗ کَانَ بِیۡ حَفِیًّا ﴿۴۷﴾﴾

''آپ پر سلامتی ہو' میں اپنے ربّ سے دعا کروں گا کہ وہ آپ کو معاف کر دے۔ یقیناً میرا ربّ مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے۔''

یعنی آپ نے اپنے ربّ کی خاطر اپنے باپ کی اطاعت کو ٹھکرا دیا۔ اور اس طرح ارادے' عزم اور سیرت وکردار کی پختگی کے پہلے امتحان میں کامیاب ہو گئے۔

اس کے بعد آپ کا سامنا عوام سے ہوتا ہے جو بُت پرستی اور شرک کے انتہائی درجے کو پہنچے ہوئے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کو توحید باری تعالیٰ کا درس دینے کے لئے ان کے صنم خانے میں جاتے ہیں اور اُن کے تمام بُتوں کو' ماسوائے بڑے بُت کے' توڑ پھوڑ کر رکھ دیتے ہیں اور اپنا تیشہ بڑے بُت کے گلے میں ڈال دیتے ہیں۔ آپؑ یہ اس لئے کرتے ہیں کہ شاید قوم غور وفکر سے کام لے اور اصل حقیقت کی جانب آ سکے۔ جب اُن لوگوں نے اپنے بتوں کی یہ حالت دیکھی تو کہنے لگے: ہمارے خداؤں کا یہ حال کس ظالم نے کر دیا؟ بعض لوگ بولے: ہم نے ابراہیم نامی ایک نوجوان کو ان کا ذکر کرتے سنا تھا۔ چنانچہ وہ ابراہیم علیہ السلام کو ہجوم کے سامنے لے آئے اور اُن سے سوال کیا: ہمارے خداؤں کی یہ درگت کس نے بنائی

ہے؟ اِس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا کہ اس بڑے بُت نے یہ واردات کی ہوگی یا پھر اپنے ان ٹوٹے ہوئے معبودوں سے پوچھ لو کہ انہیں کس نے توڑا ہے؟ اس پر انہیں اس بات کا احساس تو ہو گیا کہ یہ بُت تو بول سکتے نہیں اور مت تو ہماری ہی ماری گئی ہے۔ گویا حضرت ابراہیمؑ کے اس اقدام سے حقیقت تو اُن پر واضح ہوگئی لیکن وہ اس کو تسلیم کر لینے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ اس بُت شکنی کے امتحان میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام سرخرو ہوتے ہیں۔ عوام کے ساتھ اس مقابلے کا ذکر سورۃ الصّٰفّٰت میں بھی ہے اور سورۃ الانبیاء میں بھی۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ٹکر وقت کے حکمرانوں سے ہوتی ہے۔ چنانچہ بادشاہِ وقت نمرود سے بحث و مباحثہ اور تصادم ہوتا ہے جو خدائی کا مدعی تھا۔ وہ ابراہیم علیہ السلام سے بھرے دربار میں اُن کے ربّ کے بارے میں بحث و مباحثہ کرتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کہتے ہیں: ''میرا رب وہ ہے جو زندگی اور موت دیتا ہے''۔ اس پر شہنشاہِ وقت کہتا ہے کہ زندگی اور موت تو میں بھی دے سکتا ہوں۔ اپنے اس دعویٰ کے ثبوت کے طور پر وہ جیل سے دو قیدی منگواتا ہے' جن میں سے ایک کی گردن اڑا دیتا ہے اور دوسرے کو آزاد کر دیتا ہے۔ اس کج بحثی کا رویہ دیکھ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام اس سے کہتے ہیں کہ میرا ربّ سورج کو مشرق سے طلوع کرتا ہے اگر تو واقعی خدائی اختیار رکھتا ہے تو تُو اسے ذرا مغرب سے نکال کر دکھا!۔ اس پر وہ منکرِ حق ششدر ہو کر رہ جاتا ہے اور اس چیلنج کا کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ اس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جابر اور باغی خدا بادشاہ کے سامنے کلمۂ حق کہنے کا حق ادا کر دیا اور اس حق گوئی و بے باکی کے امتحان میں بھی سرخروئی حاصل کی۔

اس کے بعد ایک اور بڑا امتحان ہوتا ہے کہ نمرود اس شکست کے بعد آپؑ سے کہتا ہے کہ یا تو اپنی اس دعوتِ توحید سے کنارہ کش ہو جاؤ' ورنہ موت کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے مبنی برحق موقف سے بال برابر ہٹنے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ نمرود نے بھرے دربار میں اپنی شرمناک شکست کی خفت مٹانے کے لئے' نیز اپنے عمائدین اور عوام کے مطالبے پر حکم دیا کہ آگ کے ایک بہت بڑے الاؤ میں ابراہیم (علیہ السلام) کو جلا ڈالو۔ حکم کی تعمیل کی گئی اور آپؑ کو آگ میں کود پڑنے کے لئے کہا گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام آگ میں کود پڑے لیکن اللہ نے آگ کو آپؑ کے لئے گل و گلزار بنا دیا۔ آپؑ اس امتحان میں بھی فتح مند ہوئے۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام سنت انبیاء کے مطابق ہجرت فرماتے ہیں' کیونکہ اب

آپؑ پر وطن کی سرزمین تنگ ہوگئی ہے اور لوگ آپؑ کی جان کے درپے ہو گئے ہیں۔ آپؑ بغیر کسی منزل کے تعین کے اس توکل پر ہجرت فرماتے ہیں کہ میرا خدا ہی میری رہنمائی فرمائے گا۔ اسی ہجرت کی زندگی کے دوران آپؑ نے اللہ سے چند حامی و مددگار دینے کی دعا کی' جو اوّلاً حضرت اسماعیل علیہ السلام کی پیدائش کی صورت میں پوری ہوئی۔ اس کے بعد آپؑ کے آخری اور انتہائی صبر آزما امتحان کا آغاز ہوتا ہے' جس کا نقشہ صورت الصافات میں اللہ تعالیٰ نے یوں کھینچا ہے:

﴿رَبِّ هَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۰۰﴾ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِیْمٍ ﴿۱۰۱﴾ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْیَ قَالَ یٰبُنَیَّ اِنِّیْ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَا ذَا تَرٰی ؕ قَالَ یٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۫ سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۱۰۲﴾ فَلَمَّاۤ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ ﴿۱۰۳﴾ وَنَادَیْنٰهُ اَنْ یّٰۤاِبْرٰهِیْمُ ﴿۱۰۴﴾ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْیَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۰۵﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِیْنُ ﴿۱۰۶﴾ وَفَدَیْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۰۷﴾ وَتَرَكْنَا عَلَیْهِ فِی الْاٰخِرِیْنَ ﴿۱۰۸﴾ سَلٰمٌ عَلٰۤی اِبْرٰهِیْمَ ﴿۱۰۹﴾ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۱۰﴾ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۱۱﴾﴾

''اے پروردگار! مجھے ایک بیٹا عطا کر جو صالحوں میں سے ہو۔ پس ہم نے اس کو ایک حلیم (بردبار) بیٹے کی خوشخبری دی۔ وہ بیٹا جب اس کے ساتھ دوڑ دھوپ کرنے کی عمر کو پہنچ گیا تو (ایک روز) ابراہیمؑ نے اس سے کہا: بیٹا! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں' اب تو بتا تیرا کیا خیال ہے؟ اُس نے کہا: ابا جان جو کچھ آپؑ کو حکم دیا جا رہا ہے اسے کر ڈالئے' آپؑ ان شاء اللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔ آخر کو جب اُن دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دیا تب ہم نے ندا دی کہ اے ابراہیمؑ! تو نے خواب سچ کر دکھایا۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی۔ اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیہ میں دے کر اس بچے کو چھڑایا اور اس قربانی کو (بطور یادگار ہمیشہ کے لئے) بعد کی نسلوں کے لئے چھوڑ دیا۔ سلام ہو ابراہیمؑ پر۔ ہم نیکی کرنے والوں کو یقیناً ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً وہ ہمارے مؤمن بندوں میں سے تھا۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگ مانگ کر بیٹا لیا اور جب یہ بیٹا جوان ہو رہا تھا تو اللہ کی جانب سے محبت و جذبات اور امیدوں اور تمناؤں کے امتحان کا مرحلہ آ گیا۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ابراہیمؑ کو خواب میں حکم ہوا کہ وہ اسماعیلؑ کو قربان کر دیں۔ دونوں باپ بیٹے نے اللہ کے اس حکم کو بخوشی قبول کر لیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام جن کی عمر سو برس ہے' اپنے تیرہ سالہ بیٹے کو پیشانی کے بل پچھاڑ دیتے ہیں' تا کہ چہرہ سامنے نہ رہے کہ کہیں جذباتِ پدری عین وقت پر جوش میں نہ آ جائیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بیٹے کے گلے پر چھری پھیر دیتے ہیں تو ممتحن خود پکار اٹھتا ہے کہ اے ابراہیمؑ! تم اپنی آزمائش میں کامیاب ہو گئے ہو۔ ہم تمہاری کامیابی کو تسلیم کرتے ہیں! گویا ممتحن کو بس کرنا پڑی' جس کا امتحان لیا جا رہا تھا اس نے بس نہیں کی۔ خود ممتحن پکار اٹھا کہ یہ واقعتاً بہت کڑا' بہت مشکل اور بہت کٹھن امتحان تھا۔ اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بدلے میں ایک بڑی قربانی دے کر ان کو چھڑایا۔ یہ جنت کا ایک مینڈھا تھا جو زمین پر لا کر ذبح کیا گیا۔

ان ہی تین امتحانات سے گزرنے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امام الناس کے مقام پر فائز کیا گیا اور انہیں خُلّتِ الٰہی سے نوازا گیا۔ مزید برآں حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی داستانِ عزیمت و امتحان کے مختلف ابواب و اوراق کو مناسکِ حج کی صورت میں محفوظ کر دیا گیا۔ چنانچہ حج اور عیدالاضحیٰ دو ایسی عبادات اور شعائر ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کے گرد گھومتے ہیں۔ قربانی حج کا ایک بنیادی رکن ہے اور عیدالاضحیٰ کے موقع پر پورے روئے ارضی پر ''قربانی'' حج ہی کی توسیع کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ درحقیقت اُسی عظیم قربانی کی یاد ہے جو ہر سال عیدالاضحیٰ کی صورت میں منائی جاتی ہے اور اس موقع پر دنیا بھر میں کروڑوں جانور قربان کئے جاتے ہیں۔ ایک لحاظ سے یہ قربانی حضرت اسماعیل علیہ السلام کا فدیہ ہے اور دوسرے لحاظ سے اس کا مقصد یہ ہے کہ اُمت مسلمہ کے ہر فرد کے دل میں اس جذبے کو تازہ کیا جاتا رہے کہ وہ اپنی پیاری سے پیاری چیز بھی اللہ کی راہ میں قربان کرنے کے لئے ہر لحہ تیار رہے' جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مذکورہ بالا ہر امتحان کا سامنا محض توحید باری تعالیٰ اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کی خاطر کیا۔ ہمیں اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھنا چاہئے کہ کیا ہم بھی اللہ کی توحید کے لئے ایسا ہی جذبہ صادق اپنے سینوں میں رکھتے ہیں اور تسلیم و انقیاد اور اطاعت و فرمانبرداری کے جذبات سے سرشار ہیں؟ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رہنا چاہئے کہ جانور کی قربانی ایک ظاہری عمل ہے اور اس کا باطن

''تقویٰ'' ہے جو اصلاً مقصود ہے۔ اللہ تک ہمارے قربان کردہ جانوروں کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا' بلکہ ہمارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ اگر اس قربانی میں تقویٰ اور اصل روح نہیں تو ہمیں اس عمل کا کوئی اجر و ثواب نہیں مل سکے گا۔ قربانی کی اصل روح تو وہ امتحان' آزمائش اور ابتلاء ہے' اور اس میں کامیابی کا وہ تسلسل ہے جس سے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ساری زندگی عبارت ہے۔ ہمیں سوچنا چاہئے کہ ہم یہ قربانی (یا قربانیاں) تو دے رہے ہیں' آیا حقیقت میں بھی ہم اپنے جذبات و احساسات اور ذاتی مفادات کو قربان کر سکتے ہیں! اور کیا واقعتاً ہم اپنی محبوب ترین اشیاء کی اللہ کی راہ میں قربانی دے سکتے ہیں! اگر ہم ایسا کر سکتے ہیں تو ہماری یہ قربانیاں بھی قابلِ تحسین ہیں۔ اور اگر ہم اللہ کی رضا کے لئے کوئی جذبۂ ایثار نہیں رکھتے تو جانوروں کی یہ قربانی بغیر روحِ قربانی کے ہے' جس کا کوئی فائدہ نہیں' ماسوائے گوشت کھانے اور نمود و نمائش کے!

اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم صحیح معنوں میں اپنے مفادات' اپنے جذبات' اپنے احساسات اور اپنی محبتیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام و ہدایات پر قربان کر سکیں اور اپنا تن من دھن اس کی رضا کے لئے' اس کے دین کی سربلندی کی خاطر قربان کر سکیں۔ گویا از روئے الفاظ قرآنی:

﴿اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝﴾ (الانعام)

تذکیر و موعظت

مَتَاعُ الْغُرُورِ

تحریر: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

متاعُ الغُرور کا معنی ہے دھوکے کا سامان۔ قرآن حکیم میں دنیا کی زندگی کو متاعُ الغُرور کہا گیا ہے۔ غَرَّ، یَغُرُّ دھوکہ دینے کے معنوں میں آتا ہے۔ سورۃ الانفال میں ہے: ﴿غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ﴾ (آیت ۴۹) ''دھوکہ دیا اُن کو اُن کے دین نے''۔ سورۃ الانعام میں فرمایا: ﴿غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا﴾ (آیت ۱۳۱) ''دنیا کی زندگی نے انہیں دھوکہ دیا''۔ اسی طرح ان معنوں میں یہ لفظ قرآن حکیم میں کئی جگہ آیا ہے۔ اسی سے غرور اور مغرور کے الفاظ بنے ہیں جن کا معنی بالترتیب ''دھوکہ'' اور ''دھوکہ کھایا ہوا'' ہیں۔ یہ دونوں لفظ اردو میں بھی مستعمل ہیں مگر اردو میں غرور تکبر کے معنوں میں اور مغرور متکبر کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ تکبر اصل میں دھوکہ ہی ہے' کیونکہ جو تکبر کرتا ہے اُسے اپنی بڑائی کا زعم ہو رہا ہوتا ہے' حقیقت میں وہ بڑا نہیں ہوتا۔ اُس کی بڑائی عارضی اور ناپائیدار ہے' وہ آناً فاناً اپنی بڑائی سے محروم ہو سکتا ہے۔ پس مغرور اصل میں وہی شخص ہے جسے اپنی کسی صلاحیت پر دھوکہ ہو رہا ہو۔

دنیا کی زندگی بہت بڑی حقیقت ہے جسے قرآن میں متاع الغرور (دھوکے کا سامان) کہا گیا ہے۔ انسان دنیا میں امتحان کی غرض سے بھیجا گیا ہے۔ اسے متنبہ کر دیا گیا ہے کہ اس کی زندگی کا خاتمہ موت کے ساتھ ہو جائے گا اور حتمی' یقینی اور نہ ختم ہونے والی زندگی کا آغاز ہو جائے گا۔ پھر یا تو ابدی آرام و راحت ہو گا یا دردناک عذاب۔ دنیا کی زندگی دھوکہ ان معنوں میں ہے کہ انسان یہاں کی رونق' دلکشی اور لہو و لعب کو حقیقت سمجھ کر اُن پر ریجھ جاتا ہے۔ اُس کی ساری تگ و دو کا محور پیسہ اکٹھا کر کے اچھی رہائش' اچھی سواری' اچھا لباس اور اچھی بود و باش فراہم کرنا ہوتا ہے اور اس مشغولیت میں وہ اس قدر الجھ جاتا ہے کہ آنے والی حقیقی زندگی کو یکسر فراموش کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جا بجا انسان کو حقیقت حال سے آگاہ کر دیا ہے۔ سورۃ آل عمران (آیت ۱۸۵) اور پھر سورۃ الحدید (آیت ۲۰)

میں ارشاد ہوا: ﴿وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾ ''اور دنیا کی زندگی تو بس دھوکے کا سامان ہے''۔ یعنی یہاں کی چمک دمک نرا دھوکہ ہے' اس سے بچ کر رہئے!

انسان کو دھوکے میں ڈالنے کے لئے شیطان بہت بڑا کردار ادا کرتا ہے۔ اسی لئے اُسے قرآن مجید میں ''اَلْغَرُوْرُ'' (غ پر زبر کے ساتھ) ''بہت بڑا دھوکے باز'' کہا گیا ہے اور اُس کے دھوکے میں نہ آنے کی تلقین کی گئی ہے۔ سورۃ الحدید میں ارشاد ہوا: ﴿وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ﴾ ''اور اُس بڑے دھوکے باز (شیطان) نے تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکے میں مبتلا کئے رکھا''۔ وہ اتنا زبردست دھوکے باز ہے کہ وہ انسانِ اوّل علیہ السلام کو سبز باغ دکھانے میں کامیاب ہوگیا۔ انسان جو بداعمالیاں کرتا ہے شیطان اُسے مطمئن کرتا ہے کہ یہ گناہ کے کام نہیں' بلکہ اچھے کام ہیں۔ اُن برے کاموں کے جواز میں وہ طرح طرح کے عذر سکھاتا ہے۔ قرآن میں ہے: ﴿وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ (الانعام:۴۳) ''اور شیطان نے انہیں اُن کاموں کو جو انہوں نے کئے ہیں' مزین کر کے دکھایا''۔ اسی طرح متعدد جگہ پر فرمایا گیا ہے: ﴿وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ﴾ ''اور مزین کر کے دکھائے شیطان نے ان لوگوں کو اُن کے اعمال''۔ یہ الفاظ قرآن مجید کی چار سورتوں الانفال' النحل' النمل اور العنکبوت میں آئے ہیں۔

دنیاوی زندگی میں حسن و جمال' رعنائی' خوش نمائی اور دلکشی پیدا کی گئی ہے۔ یہ بھی اسی لئے کہ انسان کا امتحان ہوجائے۔ گویا۔

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کے وہ یہ کہتے ہیں
اِدھر آتا ہے دیکھیں یا اُدھر پروانہ جاتا ہے!

اسی حقیقت کو قرآن مجید میں اس طرح واضح کیا گیا ہے:

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ﴾ (آل عمران)

''مزین کر دی گئی لوگوں کے لئے شہوات کی محبت' جیسے عورتیں' بیٹے' سونے اور چاندی کے جمع کئے ہوئے خزانے اور نشان زدہ گھوڑے اور مویشی اور کھیتی۔ یہ سامان ہے دنیا کی زندگی کا' اور اللہ ہی کے پاس ہے اچھا ٹھکانہ''۔

پس دنیا کی زندگی میں حد درجہ کشش اور محبت رکھی گئی ہے۔ تاہم دنیا کی حقیقت بھی اُسی زور

کے ساتھ واضح کر دی گئی ہے کہ ساز و سامانِ دنیا کی کشش میں کھو جانا نری ناکامی ہے۔ جسے اس امتحان میں ناکامی منظور ہو وہ دنیا کی زینت میں بے شک کھب جائے۔ جیسا کہ علامہ اقبال نے کہا۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق!

مگر حقیقت شناس لوگ ہمیشہ vigilant رہیں گے کہ نقد راحت و آرام کی تلاش میں سرگرداں ہونے کے بجائے یہاں حقیقی اور جاوداں زندگی کے حصول کے لئے کوشش کی جائے۔ البتہ آزاد منش غیر سنجیدہ اور نادان لوگ جن کے سامنے حیاتِ دُنیوی کا مقصد واضح نہیں' یا جانتے بوجھتے انہوں نے اُسے بھلا دیا ہے' وہ اس زندگی کو ہی سب کچھ سمجھے بیٹھے ہیں' ایسے ہی لوگ خسارے میں ہیں۔ کافروں کا یہی حال ہے اور کافرانہ اندازِ زندگی بھی اسی طرح ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا﴾ (البقرہ:۲۱۲) ''مزین کر دی گئی ہے کافروں کے لئے دنیا کی زندگی''۔ یہ وہ لوگ ہیں جو انجام سے غافل گمراہی میں پڑ کر صراطِ مستقیم سے ہٹ گئے ہیں اور دنیاوی زندگی ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں۔ اُن کا ایمان آخرت پر اوّل تو ہے ہی نہیں اور اگر ہے تو وہ اس قدر کمزور ہے کہ وہ کوئی نتیجہ برآمد نہیں کر سکتا۔

دنیا کی زندگی کی حقیقت کو جاننا بہت ضروری ہے۔ قرآن اسے دھوکے کا سامان کہتا ہے۔ یہاں بدکردار لوگ دندناتے پھرتے ہیں' ظالموں نے ظلم و ستم کا بازار گرم کر رکھا ہے' مالدار غریبوں کے ساتھ ناانصافی کر رہے ہیں' سرمایہ دار' جاگیردار اور صنعت کار مزدوروں کا خون نچوڑ رہے ہیں' طاقت وروں نے کمزوروں کو غلام بنا رکھا ہے' حاکموں نے محکوموں کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ اس طرح بڑے لوگوں نے عیش و عشرت میں پڑ کر خود کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے کہ ع بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست! کہ بابر عیش کر لو' دنیا میں بار بار نہیں آنا!۔ دنیا کے ساز و سامان سے بھرپور فائدہ اٹھا لو' آخرت کی فکر کو ذہن پر سوار کر کے زندگی میں تلخی' مشقت اور تکدر کیوں پیدا کیا جائے!

دھوکہ کسے کہتے ہیں؟ یہی نا کہ کسی چیز کی حقیقت کو چھپا لینا! ظاہر کچھ اور ہو اور اندر کچھ اور۔ کامیابی دکھائی دے مگر اصل میں ناکامی ہو' مفید نظر آئے مگر ہو مضر۔ اب دیکھئے دنیا کی زندگی کس طرح دھوکے کا سامان ہے۔ سادہ سی مثالوں سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔

ایک دولت مند ہے' اُس نے جائز یا ناجائز طریقے سے دولت اکٹھی کی ہے۔ گلی' محلے کے لوگ اُس سے مرعوب ہیں' اُسے جھک کر سلام کرتے ہیں اور جی حضور کہتے ہیں۔ اُس کے ہاں شادی کی تقریب ہے۔ وہ پانی کی طرح دولت بہاتا ہے۔ رقص و سرود کی محفل جماتا ہے' گھر کو رنگا رنگ روشنیوں کے ساتھ بقعۂ نور بنا دیتا ہے' آتش بازی کا مظاہرہ کرتا ہے' بلند آواز میں گانے بجا کر دُور دُور تک لوگوں کی نیندیں حرام کر دیتا ہے' تقریب ختم ہوئی لوگوں کے دلوں میں اُس کا رعب اور زیادہ ہو گیا۔ دولت کی نمائش سے اُسے باوقار' خوشحال اور معزز لوگوں کی فہرست میں نمایاں مقام مل گیا۔ اب وہ پھولا نہیں سما رہا۔ غرور سے اس کی گردن تن گئی ہے۔ موت تو آئے گی' پھر ربّ کے حضور حاضر ہونا ہوگا۔ اس سے پوچھا جائے گا دولت کو کہاں استعمال کیا؟ فضول خرچی کی؟ فضول خرچ تو شیطان کے بھائی ہوتے ہیں! تم نے قرآن میں نہیں پڑھا تھا کہ ﴿اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ﴾ (بنی اسرائیل: ۲۷) تمہاری دولت میں مسکینوں' غریبوں کا حق تھا' وہ ادا نہیں کیا۔ انجامِ کار اس غفلت کی سزا بھگتنی پڑے گی اور اس اکڑی ہوئی گردن والے طرے باز خان کو گھسیٹ کر ذلت کے عذاب سے دوچار کر دیا جائے گا۔ دیکھا دنیا کی شان و شوکت حقیقت کے اعتبار سے ذلت نکلی!

اسی طرح ایک آدمی کی چوری ہو جاتی ہے۔ بڑی تفتیش ہوئی مگر چوروں کا سراغ نہ ملا۔ جس کی چوری ہوئی اُس کا نقصان ہوا' گلی محلے کے لوگ' دوست احباب اُس کے پاس اظہارِ ہمدردی کے لئے آ رہے ہیں اور وہ اپنے نقصان پر افسردہ اور غمگین ہے۔ چوروں کا حال یہ ہے کہ جی میں پھولے نہیں سماتے' لوٹی ہوئی دولت سے عیش کر رہے ہیں' خوش ہو رہے ہیں' اتنی کامیاب چوری پر اپنے آپ کو شاباش دے رہے ہیں۔ موت آ گئی' مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ کے سامنے پیش ہوئے۔ اللہ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ہے۔ چوروں کو حکم دے گا کہ چوری کا مال اس کے مالک کو واپس کرو۔ وہ کہاں سے واپس کریں گے؟ اچھا اگر کوئی نیکیاں ہیں تو مال کے بدلے وہ مال کے مالک کو دے دو۔ اگر نیکیاں نہیں' یا ختم ہو گئی ہیں تو مال کے مالک کے گناہ اپنے سر لو۔ جب مال کے مالک کے گناہ چوروں کے کھاتے میں ڈالے جائیں گے تو چور حسرت و یاس کے ساتھ ہاتھ ملتے رہ جائیں گے اور ذلت کے عذاب میں پڑیں گے' جبکہ جس کی چوری ہوئی تھی اور مال لٹ گیا تھا بدلے میں اُس کو نیکیاں ملیں اور گناہ دور ہوئے۔ یہ لوٹا ہوا مال اُس کے لئے نجات کا باعث بن گیا۔ ہوسکتا ہے وہ اپنے اعمال کے بل بوتے پر

جنت میں نہ جا سکتا' مگر لوٹے ہوئے مال کے بدلے جو کچھ اسے ملا وہ اُسے جنت میں لے گیا۔ یہ شخص جو دنیا میں مال لٹ جانے پر افسردہ اور غمگین تھا' اب خوش ہو گیا۔ اب اُس نے جانا کہ دنیا کا غم اصل غم نہ تھا بلکہ غم کے بھیس میں حقیقی نجات کا سامان تھا۔

اس کے برعکس ایک ایسا مسکین اور نادار ہے جس پر فکرِ آخرت کا غلبہ ہے۔ وہ تقویٰ اختیار کئے ہوئے ہے۔ وہ اپنی مشکلات پر قابو پانے کے لئے کوئی ناجائز طریقہ اختیار نہیں کرتا' زندگی حلال و حرام کی مکمل پابندی کے ساتھ گزار رہا ہے' تو اس شخص کا اگرچہ دنیاوی اعتبار سے کوئی مقام نہیں' لوگوں کے دل میں اُس کی کوئی عزت اور حیثیت نہیں' مگر یہ وہ شخص ہے جس نے دنیا کی زندگی کو واقعی مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (دھوکے کا سامان) سمجھا ہے' دنیا کی چمک دمک اس کو غلط روی کی طرف لے جانے میں ناکام رہی ہے۔ یہ شخص اپنی پوری بے بضاعتی کے باوجود فیصلے کے دن عزت کے مقام پر کھڑا ہوگا جبکہ بڑے بڑے منصب دار اور دولت مند ذلت اور رسوائی سے دوچار ہوں گے۔

اسی طرح ایک دولت مند آدمی ہے۔ اپنی دولت کو اللہ کا عطیہ جانتا ہے۔ اپنی دولت کو خدا کی رضا والے کاموں میں خرچ کرتا ہے۔ فضول خرچی کے قریب نہیں جاتا۔ اچھا کھاتا ہے' اچھا پیتا ہے' مگر بے محل خرچ نہیں کرتا۔ رشتہ داروں اور نادار لوگوں کی خوب مدد کرتا ہے۔ تقویٰ شعار' عبادت گزار اور خواہشاتِ نفس پر مکمل کنٹرول رکھنے والا ہے۔ یہ صاحب ثروت آدمی وہ ہے جس نے دنیا کی زندگی کو دھوکے کا سامان سمجھا' خبردار رہا اور اس دھوکے سے بچا رہا۔ یہ بھی فیصلے کے دن عز و شرف کے مقام پر ہوگا۔

رسول اللہ ﷺ نے بھی دنیا کی زندگی کی حقیقت پورے طور پر واضح کر دی تاکہ افرادِ اُمت خبردار رہیں اور اُن کے پاؤں پھسلنے نہ پائیں۔ آپ ﷺ کا اپنا طرزِ عمل دوسروں کے لئے ہمت افزا ہے۔ ایک دفعہ آپؐ چٹائی پر سو کر اٹھے تو بدن پر چٹائی کے نشان تھے۔ حضرت عمر فاروق ؓ پاس تھے' دیکھ کر عرض کیا کہ ہم آپؐ کے لئے کیوں نہ ایک بچھونا بنا دیں! آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے اس دنیا سے کیا سروکار! میری مثال اِس دنیا میں اُس سوار کی سی ہے جو کسی درخت کے سایہ میں کچھ دیر بیٹھا اور پھر اسے چھوڑ کر چل دیا''۔ (ریاض الصالحین)

آپ ﷺ نے فرمایا: ''دنیا مؤمن کا قید خانہ اور کافر کی جنت ہے''۔ (مسلم) یعنی مؤمن کو تو شرعی پابندیوں کے ساتھ زندگی گزارنی ہے' مگر کافر کو اگلی زندگی کی کوئی فکر نہیں' وہ یہاں عیش و عشرت کے مزے لوٹتا ہے۔

آپ ﷺ نے وفات پائی تو آپ ﷺ کے ترکہ میں نہ درہم و دینار تھے نہ لونڈی و غلام، صرف سواری کا ایک سفید خچر اور اسلحہ تھا اور زمین تھی جو مسافروں کے لئے صدقہ کر دی تھی۔ (بخاری)

آپ ﷺ نے فرمایا: ''دنیا کی حقیقت اللہ تعالیٰ کے نزدیک اگر مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو وہ کافر کو ایک گھونٹ پانی تک نہ دیتا''۔ (ترمذی)

آپ ﷺ نے فرمایا: ''دنیا مردار ہے اور اس کے چاہنے والے کتے ہیں''۔ یعنی اس دنیا کی رونق، چہل پہل اور کشش محض فریبِ نظر ہے۔ حقیقت میں یہ بالکل گھٹیا سی شے ہے۔ اس کے مقابلے میں آخرت اصل اہمیت کی چیز ہے۔ آخرت کی فکر سے آزاد ہو کر خواہشاتِ نفس کی پیروی میں زندگی گزارنے والا حیوان ہی تو ہے! قرآن مجید میں دنیا کی زندگی کو لہو و لعب کہا گیا ہے۔ لہو و لعب کا مطلب ہے کھیل تماشا۔ کھیل تماشا بچوں اور نادانوں کی وقتی سی مصروفیت ہوتی ہے، اس سے کسی طرح کی پائیدار منفعت حاصل نہیں ہوتی۔ بچے کھلونوں سے کھیلتے ہیں، پھر جی بھر جاتا ہے تو انہیں پھینک دیتے ہیں۔ لہو و لعب میں کوئی ذی شعور جی نہیں لگاتا۔ کرنے کے کام تو وہ ہیں جو فلاح اور کامیابی پر منتج ہوں۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ؕ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿٦٤﴾﴾ (العنکبوت)

''اور یہ دنیا کی زندگی تو صرف بہلاوا اور کھیل ہے، اصل زندگی تو عالمِ آخرت کی ہے، کاش وہ لوگ جانیں!''

انسان کی حیثیت ایک مسافر کی ہے۔ مسافر راستے میں ٹھنڈی چھاؤں پاتا ہے تو تھوڑی دیر کے لئے سائے میں لیٹ جاتا ہے اور پھر اٹھ کر منزل کی طرف چل دیتا ہے۔ وہ مسافر نادان ہے جو اُسی سائے کو منزل سمجھ بیٹھے اور اصل منزل کو بھول جائے۔ دنیا کی زندگی ایک وقفہ ہے۔ ع ''یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر''۔ انسان کو جہاں جانا ہے اور جہاں جا کر ہمیشہ کے لئے رہنا ہے اُس زندگی کی فکر کرنا چاہئے۔ اس زندگی کے وقفے کو سب کچھ سمجھ لینا انتہائی نادانی اور حماقت ہے۔

قرآن مجید میں جگہ جگہ بتایا گیا ہے کہ انسان کے لئے دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ یہاں امتحان کی تیاری کرنا ہے، مگر یہاں مرغوب چیزوں کی کشش اس راہ میں رکاوٹ ہے۔ عقلمند انسان وہ ہے جو یہاں کی پُرکشش چیزوں یعنی عورتوں، بچوں اور دولت وغیرہ کے ساتھ واجبی

سی محبت رکھے' ان کی محبت میں اس قدر نہ کھو جائے کہ عاقبت کی فکر ذہن سے محو ہو جائے اور انہی چیزوں پر فریفتہ قبر میں چلا جائے جہاں نہ بیوی بچے کام آئیں گے نہ مال و دولت۔ ایسا انسان اپنی بے عقلی پر حسرت و یاس کے آنسو بہائے گا مگر لاحاصل۔ کسی نے سچ کہا ہے: ؎

جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جا ہے' تماشا نہیں ہے!

چونکہ دولت ہی انسان کو آزاد خیال اور خواہشات کا غلام بناتی ہے لہٰذا جو شخص حصولِ دولت اور صرفِ دولت میں راہِ راست پر رہا بس وہی کامیاب ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: ''اللہ کی قسم! مجھے اس بات کا خوف نہیں کہ تم فقر میں گرفتار ہو گے' بلکہ خوف اس بات کا ہے کہ دولت تم پر ایسے نہ چھا جائے جیسے تم سے پہلی اقوام پر چھا گئی اور تم اُن کی طرح اسے ایک دوسرے سے بڑھ کر چاہنے لگو اور یہ تمہیں بھی اسی طرح ہلاک کر دے جیسے سابقہ اقوام کو کیا تھا''۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام یہ ہے کہ کسی مسلمان کے شایانِ شان نہیں کہ وہ شریعت کی پابندیوں کو نظر انداز کر کے خواہشات کی پیروی میں لگ جائے۔ ایسا کرنے سے وہ ابدی خسارے کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔ جب وہ یومِ حساب اپنی بداعمالیوں کے سبب بُرے انجام سے دوچار ہو گا تو اُس کے بیوی بچے اور اعزہ و احباب اس کے کچھ بھی کام نہ آئیں گے۔ اس کے برعکس سچا مؤمن وہ ہے جو احکامِ شریعت پر چلنے کی سعی کرتا رہے' فرائض سے غفلت اختیار نہ کرے' حلال و حرام کی پابندیاں قبول کرے' دولت کا صحیح استعمال کرے اور کبھی بھی موت اور آخرت کو فراموش نہ کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ کوتاہیوں پر استغفار کرتا رہے۔ ایسا انسان خواہ دنیا میں کیسی ہی پُر مشقت زندگی گزارے' وہ دائمی آرام و آسائش کی زندگی سے ہمکنار ہو گا' جہاں تمام نعمتیں میسر ہوں گی' کوئی نعمت کسی بھی وقت چھینی نہ جائے گی۔

عدلِ فاروقیؓ

مولانا سید وصی مظہر ندوی

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ ۲۶ رذوالحجہ کو ایک بدبخت کے ہاتھوں زخمی ہوئے اور تین یوم کے بعد اُسی کاری زخم کے باعث ان کی وفات ہوئی۔ اس طرح تاریخِ انسانی کا وہ سنہرا دور ختم ہو گیا جس پر مسلمان ہی نہیں بلکہ پوری انسانیت فخر کرسکتی ہے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ایک عظیم فاتح، ایک بے مثال مدبر، ایک عبادت گزار درویش اور ایک زبردست ادیب تھے۔ لیکن بالآخر جس وصف نے ان کے تمام اوصاف پر سبقت حاصل کی اور جو اُن کی زندگی کا طغرائے امتیاز بنا وہ عدل ہے۔

عدل کے معنی ہیں برابری قائم کرنا۔ مثلاً جرم کے مطابق سزا دینا، قانون کے مطابق سب کے ساتھ ایک جیسا معاملہ کرنا، ہر شخص کے حقوق و فرائض میں برابری قائم کرنا، عدل کی مختلف صورتیں ہیں۔ اسی طرح انسان اگر اپنی عقل و دل اور اپنے جسم و روح کے تقاضوں میں توازن قائم رکھے تو یہ بھی عدل ہے۔

آیئے! چند متفرق واقعات میں عدلِ فاروقیؓ کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھتے چلیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کسی اہم سرکاری کام میں مشغول تھے کہ ایک شخص آیا اور اس نے کہا: امیر المؤمنین! میرے ساتھ چلیئے اور فلاں شخص سے جس نے مجھ پر ظلم کیا ہے، میرا حق دلایئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنی مشغولیات کے باعث غصہ آ گیا، انہوں نے اس کے سر پر ایک درہ مارا اور کہا: میں کہاں کا امیر المؤمنین ہوں! میں تو ہمہ وقت تمہارے قبضے میں ہوں، چاہے میں کسی کام میں بھی مشغول ہوں، تم لوگ آ جاتے ہو اور کہتے ہو چلو! فلاں سے حق دلاؤ، چلو! فلاں سے حق دلاؤ۔ وہ شخص مُنہ ہی مُنہ میں بڑبڑاتا ہوا واپس جانے لگا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے واپس بلوایا۔ وہ آیا تو درہ اس کی طرف پھینک کر کہا "حکم بجالاؤ" (یعنی میرے سر پر درہ لگاؤ) اس شخص نے کہا: نہیں، خدا کی قسم! میں آپ کی زیادتی کو اللہ کے لئے اور آپ کے لئے معاف کرتا ہوں۔

حضرت عمرؓ نے کہا: ایک بات کہو! اللہ تعالیٰ کے ہاں ثواب کی نیت سے یا میرے لئے؟ اس آدمی نے کہا: اللہ تعالیٰ کے ہاں ثواب کی نیت سے۔ تب آپؓ واپس آئے' گھر میں دو رکعت نفل نماز ادا کی' پھر اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہنا شروع کیا: ''اے خطاب کے بیٹے! تو پست تھا' اللہ نے تجھے بلند مرتبہ دیا۔ تو گمراہ تھا' اللہ نے تجھ کو ہدایت دی۔ تو ذلیل تھا' اللہ نے تجھ کو عزت بخشی' پھر تجھ کو لوگوں کے سر پر بٹھایا' پھر تیرے پاس ایک شخص انصاف طلب کرنے آیا تو تُو نے اس کو مارا' کل جب تو اپنے ربّ کے پاس جائے گا تو اس کو کیا جواب دے گا؟'' پھر دیر تک اپنے آپ کو اس طرح ملامت کرتے رہے۔

ایک صوبہ کے گورنر جب مدینہ آئے تو سواگز کے قریب کا غالیچہ اپنے ساتھ لائے اور حضرت عمرؓ کی اہلیہ کو ہدیۃً بھجوا دیا۔ حضرت عمرؓ گھر آئے تو غالیچہ دیکھ کر نہایت غصہ سے پوچھا: ''یہ تیرے پاس کہاں سے آیا؟'' انہوں نے بتایا کہ فلاں صاحب نے بھجوایا ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس غالیچہ کو اہلیہ کے سر پر کھینچ کر مارا اور باہر حکم دیا کہ وہ صاحب جو غالیچہ دے گئے ہیں اُن کو دوڑاتے ہوئے تھکا کر واپس لاؤ۔ چنانچہ وہ ہانپتے کانپتے جب پہنچے تو کہنے لگے کہ امیر المؤمنین! جلدی میں کوئی فیصلہ نہ کیجئے۔ فاروق اعظمؓ نے کہا کہ تم نے آخر میرے گھر والوں کو تحفہ کیوں دیا؟ پھر ان کے سر پر وہ غالیچہ مار کر کہا: جاؤ اسے لے جاؤ' ہم کو ایسی چیزوں کی ضرورت نہیں۔

شخصی زندگی کے ان دو واقعات کے بعد دیکھئے' حکام اور رعیت کے درمیان عدل کرنے میں حضرت فاروق اعظمؓ نے کیا نمونہ چھوڑا ہے۔ ہر حکومت اپنے عُمال اور حکام کے وقار کو بچانا اوّلین فرض سمجھتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے ہر ظلم اور زیادتی پر بالعموم پردہ ڈالا جاتا ہے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اس بارے میں عدل کی بڑی تابناک روایات چھوڑی ہیں۔

ایک بار مصر کے گورنر حضرت عمرو بن العاصؓ کے بیٹے کے بارے میں ایک شخص نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی کہ اس نے مجھ کو بلا سبب کوڑوں سے یہ کہتے ہوئے مارا کہ میں ''معزز گھرانے کا فرد ہوں''۔ پھر مجھے اس ڈر سے قید خانے میں ڈال دیا کہ میں کہیں امیر المومنین تک شکایت نہ پہنچاؤں۔ میں قید خانے سے کسی طرح بھاگ کر آیا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے گورنر کو اپنے بیٹے کے ساتھ آنے کا حکم دیا اور واقعہ کی تصدیق کے بعد شکایت کرنے والے سے کہا ''یہ کوڑا لو اور اس سے اس معزز گھرانے کے فرد کو مارو''۔ اس واقعہ کے راوی

حضرت انس ؓ کہتے ہیں کہ مارنے سے پہلے ہماری خواہش تھی کہ یہ شخص خوب مارے، لیکن جب اس نے مارنا شروع کیا تو اتنا مارا کہ تماشائی دل میں کہنے لگے کاش! اب یہ مارنا بند کر دے، لیکن حضرت عمرؓ یہی کہتے جاتے تھے کہ ''اس معزز گھرانے کے فرد کی ٹھکائی کرو!'' پھر اس سے کہا: ''یہ کوڑا ذرا گورنر صاحب کے گنجے سر پر بھی تو پھراؤ' کیونکہ بیٹے نے انہی کے زور پر تو تیرے ساتھ ظلم کیا تھا''۔ لیکن اس شکایت کرنے والے شخص نے کہا: امیر المومنین! میں نے مارنے والے کو مار کر اپنا حق پوری طرح وصول کر لیا ہے۔

سب سے حیرت انگیز واقعہ یہ ہے کہ ایک بار حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ جیسے جلیل القدر صحابی کے بارے میں شکایات موصول ہوئیں۔ اس وقت وہ ایرانی افواج کے خلاف لڑنے والی فوج کے کمانڈر اور مفتوحہ علاقوں کے گورنر تھے۔ ایرانی فوج نہاوند میں جمع ہو کر ایک فیصلہ کن لڑائی کی تیاری کر رہی تھی۔ لیکن اس نازک موقع پر بھی آپؓ نے شکایت کی تحقیق کرانے میں ادنیٰ تاخیر نہ کی۔ تحقیقاتی کمیشن بھیجا' جس نے بالکل کھلی تحقیق کا طریقہ اختیار کیا اور ہر شخص کو اپنی شہادت پیش کرنے کی دعوت دی۔ تحقیقات کے بعد شکایات بالکل بے بنیاد ثابت ہوئیں۔ لیکن شکایت کرنے والوں کے خلاف نہ سعد بن ابی وقاصؓ نے کوئی انتقامی قدم اٹھایا اور نہ حضرت عمرؓ نے ان کی تادیب کرنا ضروری سمجھا۔

قانون کی نگاہ میں تمام لوگوں کے مساوی ہونے کے بارے میں آپؓ نے تحریری احکام بھی جاری کئے۔ چنانچہ ابو موسیٰ اشعری ؓ کے نام اپنے اس تاریخی خط میں جس میں عدلیہ کے لئے بنیادی ہدایات دی ہیں' انہوں نے لکھا تھا: ''اپنی توجہ اور اپنی نشست و برخاست میں لوگوں کے ساتھ یکساں سلوک کرو!'' عملی طور پر بھی اس کی تعلیم دی۔ چنانچہ ایک مقدمے میں' جس میں خود حضرت عمرؓ ایک فریق تھے' جب مدینے کے قاضی نے ان کے ساتھ امتیازی سلوک کرنا چاہا تو حضرت عمرؓ نے ان کو اُن کے اس رویہ پر ٹوکا اور فریقین کے ساتھ یکساں معاملہ کرنے کی ہدایت کی۔ خود اپنے بارے میں کہتے تھے کہ جب کوئی دو آدمی میرے پاس کوئی مقدمہ لے کر آتے ہیں تو مجھے اس بارے میں ذرا بھی فکر نہیں ہوتی کہ مقدمہ کا فیصلہ کس کے حق میں ہوگا اور کس کے خلاف۔

حضرت عمر ؓ نے اپنے آقا کی چوری کرنے والے ایک غلام کا ہاتھ اس اندیشہ کی بنا پر نہ کاٹنے کا فتویٰ دیا کہ شاید غلام کو آقا نے فاقہ کشی پر مجبور کر دیا ہو۔۔۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے ایک غیر مسلم بوڑھے کو سوال کرتے دیکھا تو اُس سے پوچھا کہ تو کیوں سوال کر رہا ہے؟

اس نے کہا کہ جزیہ کی ادائیگی کے لئے' کیونکہ میں اب کما کر جزیہ ادا نہیں کر سکتا۔ آپؓ نے فرمایا یہ تو بڑی ناانصافی ہوگی کہ جوانی میں ہم اس سے ٹیکس وصول کریں اور بوڑھے ہونے پر اسے بھیک مانگنے کے لئے چھوڑ دیں۔ پھر آپؓ نے غیر مسلم معذوروں کے لئے بھی وظائف مقرر کر دیئے۔

اب ذرا زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں بھی توازن کی چند مثالیں دیکھئے:

ایک دفعہ آپؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے ہیں' تو آپؓ نے اس کو ہدایت کی کہ اپنی صورت انسانوں جیسی بناؤ' درندوں جیسی نہیں ——— ایک دفعہ ایک صاحب کو دیکھا کہ وہ فجر کی جماعت میں نہ پہنچے' پوچھنے پر معلوم ہوا کہ رات کو دیر تک عبادت کرنے کی وجہ سے آنکھ دیر سے کھلی' آپؓ نے فرمایا کہ ساری رات کی عبادت بھی نمازِ فجر کا بدل نہیں بن سکتی ——— آپؓ نے ایک بار ایک شخص کو اس بنا پر تنبیہہ کی کہ اس نے اپنے جانور پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ لاد رکھا تھا ——— ایک عابد و زاہد نوجوان کو جو جہاد میں حصہ لینا چاہتا تھا' آپؓ نے اس لئے جہاد پر جانے سے روک دیا کہ اس کے والدین عمر رسیدہ اور خدمت کے محتاج تھے ——— عورتوں اور گھر والوں کی رعایت کرتے ہوئے سپاہیوں کو محاذ سے جلد از جلد واپس آنے کے احکام جاری کئے۔

یہ مختلف قسم کے واقعات بتاتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے زندگی کے ہر پہلو میں عدل قائم کیا تھا۔ لیکن یہ نہ سمجھئے کہ یہ عدل حضرت عمرؓ کی کوئی اپنی ایجاد تھی' بلکہ یہ عدل دراصل اسلامی تعلیمات پر مبنی تھا' جس نے ہم کو بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء اور رسول اس لئے بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اس لئے اتاری کہ لوگ انصاف پر قائم ہو جائیں۔

دعوت فکر

نصابِ زکوٰۃ: اجتہاد کی ضرورت

تحریر: محمد سلیمان تنولی

اسلام کے اہم بنیادی رکن زکوٰۃ کا منشاء دولت کی غیر مساوی تقسیم سے پیدا ہونے والی محرومیوں کو کم کرنا ہے اور اس کا طریقہ امیروں سے لے کر غریبوں میں بانٹنا ہے۔ مختلف ادوار میں دولت متفرق طریقوں سے ذخیرہ کی جاتی رہی۔ اس لئے مختلف اشیاء کے لئے حدیث نبویؐ میں نصاب کی مقدار اور زکوٰۃ کی شرحیں جدا جدا مقرر کی گئیں اور نئی اشیاء کے لئے حدیث میں دیئے گئے نصاب اور شرحوں کی روشنی میں نصاب اور زکوٰۃ کی شرحیں مقرر کی جاتی رہیں۔ پیسہ (money) کا نصاب مقرر کرنے میں اس وقت تک کوئی خاص مسئلہ پیدا نہ ہوا جب تک پیسہ سونے چاندی کے سکّوں اور سونے میں قابل تبدیلی کرنسی نوٹوں کی شکل میں تھا۔ گزشتہ صدی کی ابتداء تک پیسہ کا تعلق سونے اور چاندی دونوں دھاتوں سے تھا۔ بعد میں اکثر ممالک میں یہ تعلق صرف سونے کے ساتھ رہ گیا۔ اگست ۱۹۷۱ء کے بعد سے کسی قابل ذکر ملک کے پیسے کا یا کرنسی نوٹوں کا تعلق سونے سے نہیں۔ پاکستان میں زکوٰۃ وعشر آرڈیننس ۱۹۸۰ء کے ذریعے صرف زکوٰۃ کا نصاب مقرر کرنے کے لئے کاغذی یا کتابی پیسے کا تعلق چاندی سے جوڑ دیا گیا ہے۔ اس آرڈیننس میں نصاب کی تعریف یوں ہے:

> ''جن اثاثوں پر زکوٰۃ لاگو ہوتی ہے ان کی نسبت سے' ماسوا زرعی پیداوار اور چراگاہوں میں مفت پلنے والے جانوروں کے' نصاب سے مراد ۶۱۲.۳۲ گرام چاندی' نقدی یا سامانِ تجارت جس پر از روئے شریعت زکوٰۃ قابل ادا ہو اور ان کی مجموعی مالیت ۶۱۲.۳۲ گرام چاندی کی مالیت کا برابر ہو' جس کا ہر سال زکوٰۃ ایڈمنسٹریٹر جنرل زکوٰۃ اعلان کرے۔ اگر کسی شخص کے اثاثے محض سونے پر مشتمل ہوں اس کا نصاب ۸۷.۴۸ گرام سونا ہے۔'' (بحوالہ اسلامک اکنامکس' مصنفہ محترمہ فرزانہ بخاری)

نصاب کی اس تعریف کی رو سے اس سال یکم رمضان کو جس شخص کے پاس چھ ہزار روپے کے لگ بھگ (۹۸ روپے فی دس گرام چاندی کے لحاظ سے) پیسہ تھا وہ صاحبِ نصاب

تھا' اس پر زکوٰۃ واجب الادا تھی اور وہ خود مستحق زکوٰۃ نہیں تھا۔ گویا کہ وہ امیر آدمی ہے جس سے پیسہ لے کر غریبوں کو دیا جائے گا۔

زکوٰۃ کے نصاب کے تعین میں روپے اور دیگر قابل زکوٰۃ سامان کو چاندی کے ساتھ منسلک کرنے سے کئی سوال پیدا ہوتے ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ موجودہ دور میں جس شخص کے پاس چھ ہزار روپے کے لگ بھگ پیسہ جمع ہو جائے تو کیا وہ امیر ہے کہ اس سے لے کر غریب کو دیا جائے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ پیسہ (money) کو چاندی کے ساتھ منسلک کرنے کا کیا شرعی' قانونی' عملی یا معاشی جواز ہے؟ تیسرا سوال یہ ہے کہ گزشتہ صدی کی آخری چوتھائی کے بعد والی صورت حال میں موجودہ کاغذی یا بینکوں کے تخلیق کردہ پیسے کے لئے زکوٰۃ کا نصاب مقرر کرنے کے لئے کیا اصول اختیار کیا جائے کہ سونے اور چاندی کے نرخوں میں غیر معمولی اتار چڑھاؤ یا دوسری ضروریاتِ زندگی کے مقابلے میں غیر معمولی ٹھہراؤ کی صورت میں یہ اصول ہماری رہنمائی کر سکے؟

ان سوالات کا جواب دینے سے پہلے اس سلسلے میں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کا ذکر بحث میں معاون ہوگا۔ اگلے پیراگرافوں میں اسلامی نظریاتی کونسل کی دسمبر ۱۹۸۳ء کی طبع شدہ ''مجموعی سفارشات اسلامی نظام معیشت'' کے حوالے دیئے گئے ہیں۔

اگرچہ اسلامی نظریاتی کونسل نفاذِ زکوٰۃ کے مسئلہ کو پہلے بھی اہمیت دیتی رہی تھی لیکن اس نے اس پر جنرل ضیاء الحق مرحوم کے برسر اقتدار آنے کے بعد سرگرمی سے کام شروع کیا۔ اکتوبر ۱۹۷۷ء میں ماہرینِ معاشیات اور بینکاری کا ایک پینل بنایا گیا جس کا کام دوسرے معاشی مسائل کے علاوہ زکوٰۃ وعشر پر بھی کونسل کو سفارشات پیش کرنا تھا۔ اس پینل میں ایسے افراد تھے جو معاشیات کے ساتھ ساتھ اسلام کے اقتصادی پہلوؤں کا بھی گہرا علم اور بصیرت رکھتے تھے۔ ان میں سے ڈاکٹر ضیاء الدین احمد ڈپٹی گورنر سٹیٹ بینک آف پاکستان پہلے ہی اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن تھے۔ اس پینل نے مارچ ۱۹۷۸ء کو زکوٰۃ وعشر کے متعلق کونسل کو رپورٹ پیش کی۔ زکوٰۃ کے نصاب کے متعلق پینل کی سفارش یہ تھی:

> ''آنحضرت ﷺ کے دور میں زکوٰۃ کے نصاب کے تعین کے لئے سونا چاندی اور زرعی پیداوار کے جو تین متبادل پیمانے مقرر تھے چونکہ ان تینوں پیمانوں کی متعلقہ مالیت مرورِ زمانہ کے ساتھ متفاوت ہوگئی ہے اس لئے پینل یہ محسوس کرتا ہے کہ صرف نقدی مالیت کو ہی نصاب قرار دینے پر غور کیا جائے۔ چنانچہ پانچ ہزار روپیہ کی رقم کو

بطور نصاب مقرر کرنے کی تجویز کی گئی ہے جو کہ ایک متوسط خاندان کی سال بھر کی ضروریات کی کفالت کے لئے کافی سمجھی گئی ہے''۔(صفحہ۱۵۳)

اسلامی نظریاتی کونسل نے غور و خوض کے بعد اپریل ۱۹۷۸ء میں حکومت کو جو سفارشات بھیجیں ان میں زکوٰۃ کے نصاب کے متعلق سفارش اس طرح ہے:

''اگرچہ اب تک چاندی اور سونے کے دو الگ الگ نصاب رائج رہے ہیں لیکن کونسل سفارش کرتی ہے کہ حکومت انتظامی سہولت کی بناء پر سونے کے نصاب کو زکوٰۃ کی وصولی کے لئے بطور معیار اختیار کرے۔ چنانچہ یہ اعلان کر دیا جائے کہ جس شخص کے پاس ساڑھے سات تولے سونا یا اس کے مساوی قیمت کی نقدی یا سامان تجارت موجود ہو اُسے صاحب نصاب تصور کیا جائے گا''۔(صفحہ۱۵۹)

کونسل اور وزارتِ مالیات کے نمائندوں کے مشترکہ اجلاس میں کونسل کے مزید غور کے لئے نصاب کے معاملے میں یہ نکتہ پیش کیا گیا:

''نصاب کے تعین کے سلسلے میں کیا یہ ممکن ہے کہ ساڑھے سات تولے سونا کو معیار بنانے کی بجائے ایک اوسط درجے کے خاندان کے سالانہ مصارف کو نرخوں کے اعتبار سے ملحوظ رکھ کر تعین کیا جا سکے؟''۔(صفحہ۱۶۷)

کونسل کا جواب تھا:

''زکوٰۃ کے نصاب منصوص یعنی ساڑھے سات تولہ سونا یا ساڑھے باون تولہ چاندی میں کسی ردوبدل یا کمی بیشی کی بالکل گنجائش نہیں ہے۔ کونسل نے آسانی اور یکسانیت کے لئے فقط ایک نصاب ساڑھے سات تولہ سونا اختیار کرنے کی سفارش کی ہے۔ ویسے بھی سونے کے نرخوں میں کمی بیشی کی وجہ سے دیگر ضروریات زندگی میں بھی اس نسبت سے فرق پڑتا ہے۔ لہٰذا اس نقطۂ نگاہ سے بھی یہی معیار بہتر ہے جس کا نفاذ عملاً آسان بھی ہے''۔(صفحات ۱۶۸۔۱۶۹)

زکوٰۃ و عشر آرڈیننس وزارت مالیات اور وزارت قانون کے باہمی اشتراک سے تیار ہوا' جس کو صدر مملکت نے ۲۰ جون ۱۹۸۰ء کو ملک میں نافذ کر دیا۔ اس آرڈیننس کے مندرجات کے متعلق اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ خاموش ہے' لیکن ابتدائی آرڈیننس میں کونسل کی نصاب کے متعلق سفارش کو نظر انداز کر دیا گیا۔ آرڈیننس میں نصاب کی تعریف کی بجائے ''صاحب نصاب'' کی ایک مہمل سی تعریف شامل کی گئی۔ یہ سب کچھ غالباً عجلت میں کیا گیا اور نقدی کے معاملہ میں جس شخص کے بچت بینک کھاتہ میں ایک ہزار روپے سے

زائد رقم تھی اس پر زکوٰۃ لگا دی گئی۔ بینک کھاتوں سے زکوٰۃ اس طرح کاٹی گئی کہ بہت سے مضحکہ خیز واقعات ہوئے۔

اسلامی نظریاتی کونسل نے ۳۱ جولائی ۱۹۸۰ء کو اس آرڈیننس میں چند ترامیم وزارت مذہبی امور کو بھیجیں جن میں نصاب کی تعریف اس طرح کرنا تجویز کیا گیا:

''صاحبِ نصاب کی تعریف اس طرح کی جائے' اس سے مراد وہ شخص ہے جو سوائے اس کے کہ جس حد تک اس آرڈیننس کے تحت عشر کا اس سے تعلق ہو' ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی مالیت کے برابر روپے یا سونا یا سامانِ تجارت یا ان چاروں اشیاء میں سے کچھ چیزیں جن کی کل مالیت ساڑھے باون تولے چاندی کے برابر ہو' کا مالک ہو' مگر شرط یہ ہے کہ ساڑھے باون تولے چاندی کی یہ قیمت ہر سال زکوٰۃ کی منہائی کے لئے معیار قرار دے دیا گیا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ صرف ان لوگوں پر عائد ہونی چاہئے جو بینکوں اور دیگر مالیاتی اداروں کے اندر اپنے حسابات میں اتنی مالیت کی رقم رکھتے ہوں''۔ (صفحہ ۱۸۸'۱۸۹)

کونسل کی سفارش کے مطابق آرڈیننس میں اکتوبر ۱۹۸۰ء میں ترمیم کے ذریعے نصاب کی وہ تعریف شامل کر دی گئی جو اس مضمون کے پہلے پیراگراف میں دی گئی ہے۔ کونسل کی رپورٹ ۱۹۸۲ء کے مطابق نصاب کے متعلق کونسل کا متفقہ فیصلہ یہ تھا:

''نصاب کی تعریف جو اس وقت قانون میں ہے' وہ صحیح ہے' اسے باقی رکھا جائے''۔ (صفحہ ۲۲۰)

اس سارے عمل میں یہ واضح نہیں کہ ۱۹۸۰ء میں آرڈیننس نافذ ہونے کے بعد کونسل نے اپنی پہلی سفارش ساڑھے سات تولہ سونا کے بجائے نصاب کے لئے ساڑھے باون تولہ چاندی کو کیوں معیار بنایا؟

اب ہم دوسرے پیراگراف میں اٹھائے گئے سوالات کی طرف آتے ہیں۔ کیا چھ ہزار روپے کے لگ بھگ (ساڑھے باون تولہ چاندی کی تقریباً قیمت) پیسہ رکھنے والا امیر ہے یا غریب؟ غریب کی تعریف مختلف علاقوں اور زمانوں میں مختلف رہی ہے۔ سالانہ' ماہانہ یا یومیہ آمدنی یا فی کس خوراک کی کلوریوں کی بنیاد پر غربت یا عدم غربت کا تعین کیا جاتا ہے۔ امریکہ میں پانچ افراد کے کنبہ کی ماہوار آمدنی پونے دو ہزار ڈالر (تقریباً ایک لاکھ ۱۸ ہزار روپے) سے کم ہو تو انہیں غریب سمجھا جاتا ہے۔ پاکستان میں ایسے کنبے کی ماہوار آمدن چھ ہزار روپے ہو تو اسے غربت کے قریب سمجھا جاتا ہے۔ عام معیار یہ ہے کہ جن لوگوں کی آمدنی اوسط معیارِ

زندگی بسر کرنے کے لئے ناکافی ہو اور وہ اپنی اشد ضروریاتِ زندگی کو بمشکل پورا کر رہے ہوں وہ غریب ہیں۔ ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بعض نیم سرکاری ادارے اور بینک اپنے کلیریکل اور اس سے نیچے درجہ کے ملازمین کو اپنی یا بچوں کی شادی کے لئے پندرہ تا پچیس ہزار روپے گرانٹ دیتے ہیں۔ بعض صورتوں میں پاکستان بیت المال سے پچاس ہزار روپے تک گرانٹ دی جاتی ہے۔

چھ ہزار روپے ایک متوسط خاندان کا بمشکل ایک ماہ کا خرچ ہے۔ اس دور میں جبکہ ایک عام خاندان کا بجلی اور گیس کا بل ہی دو ہزار روپے سے بڑھ جاتا ہے' چھ ہزار روپے کی رقم کی کوئی حیثیت نہیں۔ پھر خدانخواستہ اگر بیروزگاری یا بیماری جیسی ناگہانی صورت حال سے واسطہ پڑ جائے تو یہ چھ ہزار روپے کی پونجی چند دن بھی پورے نہ کرے گی۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ معیارِ زندگی بدلنے سے بھی معیارِ غربت بدلتا ہے۔ آج سے سو سال قبل ایک امیر کو بھی وہ سہولتیں میسر نہ تھیں جو آج خطِ غربت کے قریب شخص کو حاصل ہیں۔ گڈ گورننس کی قدریں بدلنے سے آج ایک درمیانے اور غریب طبقے کو وہ سہولتیں مفت میسر نہیں جو آج سے پچاس سال پہلے تھیں۔ آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے میٹرک تک تعلیم اچھے معیار کے ساتھ غریب اور متوسط طبقوں کے لئے تقریباً مفت تھی۔ آج غریب آدمی اپنے بچوں کے لئے مفت یا سستی معیاری تعلیم کے خیال سے ہی گھبراتا ہے۔ اسی طرح اب ہسپتالوں سے مفت علاج کا تصور ختم ہو گیا ہے۔ سرکاری نلوں سے پانی اب مفت نہیں ملتا۔ اس لئے اخراجات بھی بڑھ گئے ہیں۔ پانچ افراد کے کنبہ کو اگر رہائش' بچوں کی تعلیم و علاج وغیرہ کی سہولت بلا معاوضہ نہیں تو چھ ہزار روپے ماہوار آمدنی کے ساتھ بھی وہ غریب ہے' اور اگر وہ اپنا پیٹ کاٹ کر چھ ہزار روپے پس انداز کر لے تو وہ امیر نہیں کہلا سکتا بلکہ وہ خود دوسروں سے امداد کا طلب گار ہو سکتا ہے۔ اس ساری بات کا حاصل یہ ہے کہ موجودہ دور کے چھ ہزار روپے کے لگ بھگ پس انداز کرنے والا امیر نہیں کہ اس کو زکوٰۃ دینے کا پابند کیا جائے۔

ہمارا دوسرا سوال یہ تھا کہ موجودہ دور کے پیسے (money) کو چاندی کے ساتھ منسلک کرنے کا کیا شرعی' قانونی' عملی یا معاشی جواز ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم پیسے کو سونے کے ساتھ متعلق کرنے کے جواز پر بھی بحث کر سکتے ہیں۔ موجودہ دور کا پیسہ حکومتوں یا مرکزی بینکوں کے جاری کردہ کرنسی نوٹوں اور بینکوں کے تخلیق کردہ کتابی پیسے پر مشتمل ہے جبکہ دنیا میں کئی ہزار سال سے سونے اور چاندی کے سکے پیسے (money) کے طور پر کام کرتے رہے

ہیں۔ سترہویں صدی عیسوی سے کاغذی بینک نوٹ اور حکومتوں کے جاری کردہ نوٹ بھی سونے چاندی کے سکّوں کے ساتھ چلتے رہے۔ تاہم یہ کاغذی نوٹ سونے یا چاندی میں قابل تبدیلی تھے۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں پیسے کا دو دھاتی نظام تقریباً ختم ہو گیا۔ چاندی کا اس سلسلے میں کوئی کردار نہ رہا اور پیسہ زیادہ تر ممالک میں سونے کے ساتھ متعلق ہو گیا۔ بعد میں دوسری عالمی جنگ سے پہلے گولڈ سٹینڈرڈ تقریباً ختم ہو گیا لیکن سونے کا پیسے کے ساتھ تعلق قائم رہا۔ امریکہ نے قانوناً اپنے ڈالر کی مالیت سونے میں مقرر کر رکھی تھی۔ پاکستان نے بالواسطہ طور پر سونے کو روپے کے ساتھ منسلک کیا ہوا تھا۔ چنانچہ سٹیٹ بینک آف پاکستان آرڈر ۱۹۴۸ء اور سٹیٹ بینک آف پاکستان ایکٹ ۱۹۵۶ء میں سٹیٹ بینک کی تحویل میں موجود سونے کے ۰.۲۶۸۶۰۱ گرام کو ایک پاکستانی روپے کے برابر قرار دیا گیا۔ ۱۹۵۸ء میں ایک ترمیم کے ذریعے ایک روپے کے برابر سونے کی مقدار کو ۰.۱۸۶۲۱ گرام کر دیا گیا۔ بعد میں اس سلسلے میں آئی ایم ایف کی روایت اپنائی گئی اور کچھ سالوں بعد سونے کی قیمت منڈی کے اعتبار سے لگائی جانے لگی۔ تاہم جب ۱۵/اگست ۱۹۷۱ء کو امریکہ نے ڈالر کے سونے میں ناقابل تبدیل ہونے کا اعلان کیا تو سونے کا پیسے سے تعلق تقریباً ختم ہو گیا۔ اس طرح اب زکوٰۃ کے تعین کے لئے روپے کو چاندی یا سونے سے منسلک کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ شرعاً جواز تب تھا جب قانوناً نوٹ چاندی یا سونے میں قابل تبدیلی تھے۔ اب ایسا نہیں' اس لئے شرعاً کوئی جواز نہیں۔

عملی طور پر بھی ایسا ممکن اس لئے نہیں کہ گزشتہ پچاس سال میں سونے اور چاندی کی قدر میں تفاوت بہت بڑھ گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ کے دور میں اور بعد میں گزشتہ صدی کے اوائل تک سونے کی قیمت چاندی سے ۷ تا ۱۰ گنا زیادہ رہی تھی لیکن اب اس دور میں سونا چاندی (ہم وزن) کی نسبت ۷۰ تا ۸۰ گنا زیادہ مہنگا ہے۔ اس لئے معاشی طور پر بھی چاندی کو زکوٰۃ کے نصاب کے لئے روپے سے منسلک کر کے بنیاد بنانا درست نہیں' کیونکہ چاندی کی قیمت میں اضافہ ضروریاتِ زندگی میں اضافہ کی نسبت بہت کم رہا ہے۔ چاندی کی طرف پیسے کی بنیاد کے طور پر لوٹنے کا امکان نہیں۔ جہاں تک سونے کا تعلق ہے اس کی قیمتوں میں اضافہ ضروریاتِ زندگی کی قیمتوں میں اضافہ کی نسبت سے رہا ہے۔ اس کے علاوہ بعض ماہرین مالیات کے نزدیک عالمی مالیاتی نظام میں ابتری اور بدنظمی کو دوبارہ گولڈ سٹینڈرڈ اپنا کر دور کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح سونے کے مالیات کی دوبارہ بنیاد بننے کے امکانات

ہیں۔ تاہم موجودہ صورت حال میں سونے یا چاندی کو روپے پیسے کا زکوٰۃ کا نصاب مقرر کرنے کے لئے بنیاد نہیں بنایا جا سکتا' کیونکہ موجودہ دور کے پیسے (money) کی قدر سونے چاندی کی بجائے اس پر منحصر ہے کہ ملک میں قابل فروخت اشیاء و خدمات کے مقابلہ میں پیسے کی رسد یا مقدار کتنی ہے۔ جوں جوں اشیاء و خدمات کے مقابلہ میں پیسے کی رسد یا مقدار میں اضافہ ہوگا' پیسے کی قدر کم ہوگی۔ چاندی اور سونے کو بذاتِ خود زکوٰۃ کے نصاب کے لئے حدیث نبویؐ نے جو بنیاد بنایا ہے وہ اپنی جگہ برقرار رہے گی لیکن چونکہ موجودہ پیسے کا کوئی قانونی یا عملی تعلق چاندی یا سونے سے نہیں اس لئے پیسے کا نصاب مقرر کرنے کے لئے چاندی یا سونا غیر متعلق ہیں۔

اب آخری سوال کی طرف آتے ہیں کہ موجودہ کاغذی (کرنسی نوٹ) یا بینکوں کے تخلیق کردہ پیسے کے لئے زکوٰۃ کا نصاب کس اصول پر مقرر کیا جائے۔ اس سلسلے میں ضمنی لیکن اہم سوال یہ بھی ہے کہ آیا نصاب میں وقت یا علاقے (ملک) کے لحاظ سے کوئی تبدیلی ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں ذہن میں رکھنا ہوگا کہ مولانا عبدالشکور اور مولانا عبدالحی فرنگی محلی کی تحقیق کے مطابق چاندی کا نصاب ۳۶ تولے ساڑھے پانچ ماشے اور سونے کا نصاب پانچ تولے اڑھائی ماشے ہے' جبکہ مروّج اور مشہور نصاب چاندی کا ساڑھے باون تولے اور سونے کا ساڑھے سات تولے ہے (آسان فقہ' حصہ دوم' مولانا محمد یوسف اصلاحی)

موجودہ رائج پیسے کا نصاب مقرر کرنے کے لئے ہمیں نصاب کے تعین کے بنیادی اصول کو ذہن میں رکھنا ہوگا۔ مسلم اور بخاری کی صحیح حدیث کے مطابق پانچ وسق سے کم کھجوروں میں زکوٰۃ نہیں ہے' پانچ اوقیہ سے کم چاندی میں زکوٰۃ نہیں ہے اور پانچ اونٹوں سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے۔

اس سلسلے میں شاہ ولی اللہؒ وضاحت فرماتے ہیں:

> ''اُس دور میں پانچ وسق یعنی تیس من کھجوریں ایک مختصر گھرانے کے سال بھر کے گزارے کے لئے کافی ہو جاتی تھیں اور یہی قیمت اور حیثیت پانچ اوقیہ چاندی اور پانچ اونٹوں کی تھی۔ اس لئے اس مقدار کے مالک کو شریعت نے خوشحال اور دولت مند قرار دے کر اس پر زکوٰۃ واجب قرار دے دی۔''
>
> (معارف الحدیث' جلد چہارم' از مولانا محمد منظور نعمانی' ص ۳۶)

اس طرح شاہ ولی اللہ کے مطابق زکوٰۃ کے نصاب کا یہ اصول قرار پایا کہ وہ ایک مختصر

خاندان کے گزارے کے ایک سال کے خرچ کے برابر ہو۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر تین تا پانچ افراد کی بنیادی ضروریات کا ایک مجموعہ (basket) سالانہ بنیادوں پر بنا کر ان کی قیمت کو مروّجہ کرنسی کے اعتبار سے نصاب قرار دیا جا سکتا ہے۔ چونکہ مرورِ زمانہ کے ساتھ بنیادی ضروریات میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے اس لئے نصاب میں تبدیلی کا جواز بھی بنتا ہے۔

نصاب میں تبدیلی کا معاملہ اہم ہے۔ ایک تو سونے اور چاندی کے دو نصابوں کی روایت۔ اس پر مولانا محمد منظور نعمانیؒ جیسے جید عالم کی یہ تحریر فکر انگیز ہے:

> ''حضرات علماء کرام کے لئے یہ بات قابل غور ہے کہ اب جبکہ روپے کی قیمت اور حیثیت زمانہ نبوت کے درہم کے مقابلے میں بہت کم ہوگئی ہے' بلکہ ہمارے ہی ملک (۱۹۶۷ء کا بھارت) میں اب پچیس سال پہلے روپے کی جو قیمت اور مالیت تھی اب اس کا بھی آٹھواں حصہ یا اس سے بھی کم رہ گئی ہے' تو اس صورت میں زکوٰۃ کا کم سے کم نصاب کیا ہوگا''۔ (معارف الحدیث' جلد چہارم ص ۳۶)

گویا کہ نصاب میں تبدیلی نہ ہونے کا معاملہ حتمی نہیں اور اس سلسلے میں غور وخوض ہوسکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ چاندی اور سونے کے معاملے میں زکوٰۃ کا نصاب ناقابل تبدیلی قرار دیا جاسکتا ہے لیکن موجودہ دور میں جبکہ پیسے (money) کی قوتِ خرید مسلسل بدل رہی ہے' پیسے کے نصاب میں وقتاً فوقتاً تبدیلی کی ضرورت رہے گی' کیونکہ موجودہ دور میں پیسے کا سونے یا چاندی سے کوئی قانونی یا عملی تعلق نہیں رہا۔

اس سلسلے میں آخری رائے علمائے دین اور اسلامی نظریاتی کونسل کی ہوسکتی ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل تو اس وقت فعال نہیں تاہم علماء کرام اس معاملہ میں غور کریں اور ضروری ہے کہ مالیات کے ماہرین سے بھی اس معاملے میں رائے لی جائے۔

نوٹ:

۱) اس مضمون میں پیسے کو زر یعنی money کے مفہوم میں لیا جائے۔

۲) مضمون نگار ایک سابق بینکار ہے۔

وہ کیا گردوں تھا.....؟

تدوین تاریخ مسلمانانِ ہند

ایک علمی، تحقیقی اور تصنیفی منصوبہ

مرتبہ: عبدالحفیظ خان

علامہ اقبال کے بقول جس طرح فرد کی زندگی میں حافظہ کی اہمیت ہے، اسی طرح کسی قوم اور ملت کی زندگی میں تاریخ کی اہمیت ہے۔ اگر کسی قوم و ملت کی تاریخ گم ہو جائے یا پردۂ گمنامی میں چلی جائے تو اس کی حیاتِ ملّی بے معنیٰ ہو جاتی ہے۔ ''دی اسلامک اکیڈمی آف ہسٹری آف انڈیا'' نے مسلمانانِ ہند کی تابناک تاریخ کی تدوین اور تصنیف کے لئے ایک عظیم پروجیکٹ تیار کیا ہے، جس کی تفصیلات ان صفحات میں پیش خدمت ہیں۔

برادران اسلام، اکابرین ملت، قائدین کرام، علماء عظام اور اہلِ فکر و دانش کی خدمت میں

ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک ہزار سالہ تاریخ مرحلہ در مرحلہ اپنا تاریخی سفر طے کرتے ہوئے آج اس مرحلے میں داخل ہو چکی ہے کہ اس کا تفصیلی جائزہ لیا جائے، اس کے حقیقی خدوخال کو ابھارا جائے، اس کے وہ درخشاں نقوش پیش کئے جائیں جن کی چکاچوند سے آج بھی اس ملک کا چپہ چپہ روشن اور تابناک ہے۔ بلاشبہ یہ تاریخ مسلمانوں کے عزم و حوصلہ اور عزیمت و پامردی کی تاریخ ہے۔ کسی قوم کی تاریخ اُس کی بڑی قیمتی متاع ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماہرین عمرانیات تاریخ کو ایک قوم کا حافظہ کہتے ہیں۔ جس طرح ایک فرد کو اُس کا حافظہ اس کے ماحول اور خود اُس کے اپنے ماضی سے جوڑتا ہے، اسی طرح تاریخ ایک قوم کو اس کے ماضی سے آشنا کرتی ہے، اس کے مخصوص مزاج اور جداگانہ تشخص کو واضح کرتی ہے

اور اس کے مستقبل کے ارتقاء کے خطوط کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

وقت کی یہ ستم ظریفی ہے کہ ہمارا رشتہ خود اپنی تاریخ اور اپنے ماضی کی فکری اور تہذیبی تحریکوں اور داستانِ فکر و عمل سے بے حد کمزور ہو گیا ہے اور ہم خود اپنے آپ کو دوسروں کی نگاہوں سے دیکھنے اور دوسروں کے بنائے ہوئے معیارات سے جانچنے لگے ہیں۔ کسی قوم کے لئے تہذیبی اعتبار سے اس سے زیادہ خطرناک صورت حال کا تصور بھی مشکل ہے۔ اس کو کسی قوم کی خودکشی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ اہل علم کا فرض ہے کہ اس خطرے کا مقابلہ کریں اور اپنی قوم کے سامنے ہی نہیں بلکہ تمام لوگوں کے سامنے تاریخ کا وہ آئینہ پیش کریں، جس میں اس کے حقیقی خدوخال نمایاں ہو سکیں۔

کسی قوم کی محض سیاسی غلامی اس کے لئے اتنی مہلک نہیں ہوتی جتنی ذہنی غلامی، فکری مرعوبیت اور احساسِ کمتری تباہ کن ہے۔ یہ ذہنی غلامی اور احساسِ کمتری قوم کو اُس وقت تک تباہ کرتی رہتی ہے جب تک کہ اس کے شکنجے میں کوئی قوم پھنسی ہوئی رہتی ہے۔ یہ احساسِ کمتری، فکری محکومیت اور ذہنی مرعوبیت اپنے ماضی سے کٹنے یا اس کے صحیح ادراک سے ناآشنا ہونے اور اپنی تاریخ سے ناواقفیت و محرومی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ مرض جب شدید ہو جاتا ہے تو اس کی فکری اور تہذیبی خودکشی کے سفر کا آغاز ہو جاتا ہے۔ جب اس کا رشتہ اپنے ماضی سے کٹ جاتا ہے تو وہ حال کی بھول بھلیوں میں بھٹکنا شروع کر دیتی ہے اور مستقبل کی تاریکیاں اپنا سایہ جما لیتی ہیں، مستقبل تاریک سے تاریک تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ تاریکیاں کسی قوم کے مستقبل ہی کو دھندلا بنا دیتی ہیں اور جب کسی قوم کا مستقبل ہی دھندلا ہو جائے تو اس کا وجود ہی ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ پھر کوئی قوم قوم نہیں رہتی، بلکہ خس و خاشاک کا ڈھیر بن جاتی ہے، جسے طوفان کے تھپیڑے بادِ پریشاں کی طرح اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر اڑائے لئے پھرتے ہیں، کوئی بھی بگولہ اسے موجِ صرصر میں تبدیل کر دیتا ہے۔ ایسی قوم کے معاملے میں سنت اللہ یہ ہے کہ وہ حیرانی اور سرگشتگی کے حوالے کر دی جاتی ہے، خواہ وہ کچھ بھی جتن کرے، چاہے جو بھی مادی اسباب و ذرائع اور وسائل فراہم کرے، اس کا اپنا وجود اور اپنا تشخص ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔

ستم بالائے ستم یہ کہ مسلمانانِ ہند نہ صرف یہ کہ اپنے ماضی سے کٹے ہوئے ہیں، بلکہ کچھ ستم ظریفوں نے دانستہ طور پر انہیں ان کے ماضی سے کاٹنے کی شاطرانہ چالیں چل رکھی ہیں۔ حقائق پر سیاہی کے دبیز پردے ڈال دیئے ہیں۔ یہ کوششیں تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی

ہیں۔ تاریخی حقائق کو توڑ مروڑ کر اور مسخ کر کے پیش کیا جا رہا ہے' بلکہ ایسا بھیانک چہرہ پیش کیا جاتا ہے کہ اچھے اچھے بھی اس سے متوحش ہو جائیں اور یہ توحش اتنا بڑھ جائے کہ خود اپنی شکل دیکھنے سے بھی کراہت محسوس ہونے لگے۔ یہ شر پسند اپنی کوششوں میں بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ انہوں نے یہ زہر درسی اور نصابی کتابوں میں بھی بھر دیا ہے' تاکہ نئی نسل اپنے ماضی سے نفرت کا جذبہ لے کر پروان چڑھے اور وہ اپنے اثاثۂ ماضی سے ذہنی اور فکری اعتبار سے کٹ کر رہ جائے' بلکہ اس پر تبرا بھیجنے لگے۔ یہ ایک بہت بڑی چال ہے' ایک بھیانک سازش ہے' جو مسلمانانِ ہند کے ساتھ کی جا رہی ہے۔ یہ ایک فتنہ ہے جس کی کوکھ سے نہ جانے کتنے فتنے جنم لے رہے ہیں۔ یہ ایک منظّم کوشش ہے' جو ہر سطح پر ہو رہی ہے۔ حکومت بھی اس جرم میں برابر کی شریک ہے۔ حکومت کی طرف سے ایسی تمام کوششوں کی ہمت افزائی کی جاتی ہے۔ ''Rewrite History'' کے نام سے ایک تحقیقاتی ادارہ کام کر رہا ہے' جس کے سربراہ کوئی مسٹر اوک ہیں' جو تاریخ کے غیر مستند ذخائر سے منتخب کر کے ایسی ایسی دور کی کوڑی نکال کر لا رہے ہیں کہ ان کی تحقیق سے عقلِ سلیم بھی شرما جائے۔

ہندوستانی تاریخ کا ہندو دور اپنی تاریخی شہادتوں اور اپنی تاریخی سند اور ریکارڈ کے لحاظ سے دیومالائی دور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس دور میں تاریخی ریکارڈ تیار کرنے کے لئے ذرائع و وسائل بھی مفقود تھے۔ لے دے کر کچھ پتھروں کی سلیں تھیں' پہاڑوں میں تراشے ہوئے کچھ پتھروں کے کتبات تھے' پتھروں کی مورتیاں تھیں۔ اس دور کی تاریخ مدوّن کرنے کے لئے صرف وہی وسائل و ذرائع تھے۔ ان ہی کی چھان پھٹک اور خورد بینی مطالعہ کی بنیاد پر پراچین سبھتا کا تصوراتی اور توہّماتی پربت چنا جا رہا ہے۔ کچھ الفاظ کی ملتی جلتی آوازوں اور تلفظ کے آہنگ سے الفاظ کا ایک گورکھ دھندا تیار کیا جا رہا ہے اور اس کو افسانوی روپ دیا جا رہا ہے' جس کی حقیقت انکل پچو اور تیر تکّے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ یہ ہے پراچین سبھتا کی احیاء پرستی کا جنون جس کی بنیاد ہی انتہائی کھوکھلی ہے۔

مسلمانانِ ہند جس دَور سے اپنی تاریخ کو وابستہ کر سکتے ہیں وہ اس لحاظ سے یقیناً ایک سنہرا دور کہا جا سکتا ہے' جس کے ایک ایک واقعہ کی تحریری دستاویزات محفوظ ہیں۔ مؤرخ ایک ایک پل کا تاریخی ریکارڈ تیار کرنے میں لگا ہوا رہا ہے۔ اس کے عینی شواہد بھی اتنے واضح اور روشن ہیں کہ ایک اندھا بھی ان تاریخی مظاہر سے انکار کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ایسے تاریخی شواہد و مظاہر سے انکار چاند پر کیچڑ اُچھالنے کے مترادف ہے۔ کور باطنی اور

خبث نیت کی بات الگ ہے۔

مسلمانوں کا ماضی روزِ روشن کی طرح تابناک ہے۔ اس پر نہ شرمانے کی ضرورت ہے' نہ کسی لحاظ سے احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے کی ضرورت ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اس کے چہرے پر جو کیچڑ ملنے کی کوشش کی گئی ہے اس کو دھو کر صاف و شفاف بنا دیا جائے' ان شاء اللہ یہ چہرہ ایک روشن چہرہ بن کر اُبھر سکتا ہے' اسی صورت میں یہ مستقبل کے لئے پیغامِ مسرت اور نویدِ انبساط کی جلوہ نمائی کر سکتا ہے۔

اس اعلیٰ مقصد کے حصول کے لئے ایک عظیم منصوبہ ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کی تدوین اور تصنیف کا عظیم پروجیکٹ تیار کیا گیا ہے جو پیشِ خدمت ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ اہلِ علم و دانش اس پروجیکٹ کا بنظر غائر مطالعہ کریں۔ یہ ایک ابتدائی اور سرسری خاکہ ہے' اس میں رنگ بھرنا ہے۔ اگر اس کو پذیرائی حاصل ہو جائے تو اس کی رنگ آمیزی کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ آپ اس کے مطالعے کے بعد اپنی رائے اور مشوروں سے ضرور نوازیں اور اپنا ہر ممکن تعاون ضرور پیش فرمائیں' ہم اس کا خیر مقدم کریں گے۔ یہ تعاون مختلف شکلوں میں ہو سکتا ہے۔ آپ اس عظیم پروجیکٹ کے لئے جس کا بجٹ لاکھوں کا ہے' خود رقمی تعاون فرمائیں' اپنے حلقۂ تعارف میں لوگوں کو رقمی اعانت کے لئے آمادہ کریں۔ اس پروجیکٹ کے لئے مختلف موضوعات پر تحقیقی اور علمی کام کرنے کے لئے خود میں آمادگی پیدا کریں' دوسرے اہل علم اور ریسرچ اسکالرز کو اس کام کے لئے آمادہ کریں اور آپ کے علم میں اس کام کے لئے جو حضرات موزوں اور مفید ہو سکتے ہیں ان کے نام اور پتے روانہ فرمائیں' تاکہ ہم خود اُن سے ربط پیدا کر سکیں۔ اس اسکیم کا وسیع پیمانے پر تعارف بھی ہمارے ساتھ بہترین تعاون ہوگا۔ جزاکم اللہ!

اللہ تبارک وتعالیٰ سے صمیم قلب سے دعا ہے کہ وہ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی توفیق عطا فرمائے اور اس راہ کے لئے زادِ سفر کی فراہمی کے لئے اپنی برکتوں کے دروازے کھول دے۔ آمین!

چالیس سالہ دورِ آزادی کا محاسبہ

ہندوستانی مسلمان، تاریخ ہند کے آئینہ میں

عام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ کوئی بھی نسل چالیس سال تک میدانِ عمل میں کارگزار رہتی ہے اور ہر چالیس سال کے عرصہ میں وہ اپنے جوہر دکھا کر میدانِ عمل سے پوری طرح ہٹ جاتی ہے اور دوسری نسل اس کی جگہ لیتی ہے۔ انسان کی مکمل جوانی، فکری و جسمانی بلوغت اور طاقت وقوت اور مضبوطی کو پہنچنے کے لئے بھی چالیس سال کی عمر کا تذکرہ قرآن مجید میں آیا ہے:

﴿حَتّٰی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً .....﴾ (الاحقاف:۱۵)

''یہاں تک کہ جب (خوب جوان ہوگیا اور) پوری طاقت کو پہنچا اور چالیس سال کا ہوگیا۔''

چالیس سال کی عمر میں آنحضورﷺ کو نبوت عطا ہوئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل کو صحرائے سینا میں تربیت کے لئے لے گئے اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا کہ اے برادرانِ قوم! اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دی ہے، انہوں نے جواب دیا کہ وہاں تو بڑے زبردست لوگ ہیں، ہم وہاں ہرگز نہ جائیں گے جب تک وہ وہاں موجود ہیں، بس تم اور تمہارا ربّ دونوں جاؤ اور لڑو، ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے فریاد کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَیْهِمْ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً﴾ (المائدۃ:۲۶)

''اچھا تو وہ ملک چالیس سال تک ان پر حرام ہے۔''

بنی اسرائیل چالیس سال تک صحرانوردی کرتے رہے اور جب پوری ایک نسل ختم ہوگئی، اور دوسری نسل جوان ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے ملک فلسطین کے دروازے ان کے لئے وا کر دیئے۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ چالیس سال کی مدت میں ایک نئی نسل پروان چڑھ کر جوان ہو جاتی ہے جو کسی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ خصوصاً موجودہ زمانے میں کسی قوم وملک کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے لئے چالیس سال کی مدت کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ یہاں

تک کہ ابھی کچھ عرصہ قبل مجلس اقوام متحدہ کا چالیس سالہ جشنِ تأسیسی بڑے دھوم دھام سے منایا گیا۔ آئندہ سال ۱۵/اگست ۱۹۸۷ء کو ہندوستان کی آزادی کے چالیس سال مکمل ہو جائیں گے۔ اس وقت کی مناسبت سے یہاں بھی ''جشن چہل سالہ'' کے انتظامات کے لئے خصوصی کمیٹیاں مقرر کی گئی ہیں اور سلور جوبلی کے بعد دوسرا عظیم جشن ہوگا' اور ایک لحاظ سے سلور جوبلی سے زیادہ اہمیت کا حامل ہوگا۔ ہندوستان کی چالیس سالہ سیاسی زندگی کا اگر جائزہ لیں تو آسانی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ایک نسل ختم ہوچکی ہے اور دوسری نسل نے سیاسی اقتدار سنبھال لیا ہے۔ وزیراعظم راجیو گاندھی نئی نسل کے نمائندے کی حیثیت سے مسند اقتدار پر متمکن ہیں۔ (۱)

مسلمان اس خیر اُمت کا نام ہے جو لا الٰہ الاّ اللہ محمد رسول اللہ کی ازلی وابدی حقیقت پر استوار ہوئی ہے۔ اس کا مزاج آفاقی اور اس کی فطرت مثبت اور تعمیری ہے۔ جس ملک میں بھی اس نے قدم رکھا اس کی تعمیر کی' اسے سنوارا اور اپنے مثبت کردار سے اس میں جان ڈال دی۔ خود ہندوستان کی سینکڑوں سالہ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں کا کردار نہ صرف مثبت اور تعمیری رہا ہے' بلکہ اس نے یہاں کی زندگی کے ہر شعبہ کو سنوارا ہے' اسے ترقی دی ہے اور اسے علم و ہنر' شعر و ادب' آرٹ اور کلچر سے مالا مال کیا ہے' اسے اسلوبِ حکمرانی اور طرزِ نظم و نسق سکھایا ہے۔ یہاں کی غذا' لباس' زبان' رسم و رواج اور آدابِ مجلس سے لے کر رفتار و گفتار تک اور بحیثیت مجموعی یہاں کی تہذیب و تمدن اور اخلاق و عادات پر اس کے اثرات آج بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔

یہ ایک زندہ و پائندہ اُمت ہے' جس نے ہمیشہ دوسروں کو زندگی دی ہے' جس نے صدیوں کی مُردہ قوموں میں جان ڈال دی اور سوتوں کو جگایا اور راہِ عمل پر گامزن کر دیا ہے۔ زندہ قوموں کی ایک نشانی یہ ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے اعمال کا محاسبہ کرتی ہیں اور اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں کا جائزہ لیتی ہیں۔

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا احتساب!

چنانچہ ۱۵/اگست ۱۹۸۷ء اُمتِ مسلمہ کے لئے ایک اہم موقع ہوگا۔ اس چہل سالہ مدت میں مسلمانوں کی بھی ایک نسل گزر چکی ہے' وہ مسلمان جو جنگِ آزادی کے لئے لڑتے اور زندگی

(۱) واضح رہے کہ یہ تحریر ۱۹۸۶ء کی ہے۔

بھر قربانیاں دیتے رہے' اپنے پیچھے جہد وعمل اور ایثار وقربانی کی ایک درخشاں تاریخ چھوڑ کر آج وہ آسودۂ لحد ہو چکے ہیں۔ ان میں ''چکی کی مشقتیں'' اٹھانے والے حسرت موہانی' صاحب ''الہلال'' و ''البلاغ'' ابوالکلام آزاد' صاحب ''سرود برسر منبر کہ ملت از وطن است'' حسین احمد مدنیؒ' عطاء اللہ شاہ بخاریؒ' ماسٹر تاج الدین' مظہر علی اظہر' ڈاکٹر ذاکر حسین اور شورش کاشمیری سے لے کر آزاد ہند فوج میں سر دھڑ کی بازی لگا دینے والے شاہ نواز اور ایسے ہی ہزاروں نہیں لاکھوں مسلمان جو ہندوستان کے ہر شہر اور قصبہ میں ایک تاریخ ساز شخصیت کے حامل تھے' آج میدان سے ہٹ چکے ہیں۔ ان سے پہلے جنگ آزادی کے وہ بزرگ جو اِس جنگ کے روحِ رواں تھے اور جنہوں نے تاریخ جنگِ آزادی کو اپنے خون' قربانیوں اور درخشاں کارناموں سے چمکا دیا تھا' کبھی بھلائے نہیں جا سکتے۔ سید احمد شہیدؒ' شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور ان کے جانباز رفقاء کی میدانِ بالاکوٹ میں شہادتیں' مبارز الدولہ کی جدوجہد' جعفر تھانیسری اور ان کے رفقاء کی تکلیفیں' بہادر شاہ ظفر اور ہندوستان کے طول وعرض میں لاکھوں مسلمانوں کا ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کی آگ میں بے خطر کود پڑنا' حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی جنگی جدوجہد اور ہجرت' شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور مفسر قرآن مولانا شبیر احمد عثمانیؒ' محمد علی جوہرؒ و شوکت علیؒ حکیم اجمل خاں' ڈاکٹر انصاری' بیرسٹر آصف علی اور ایسے ہی بزرگوں اور جنگ آزادی کے سورماؤں کی طویل فہرستوں کا لامتناہی سلسلہ ناقابلِ فراموش ہے۔

آزادی کے بعد پچھلے چالیس برسوں میں مسلمانوں نے حکومت کے اندر بھی اور باہر بھی قومی اور سیکولر جماعتوں کے ذریعہ بھی ملک کی مادی ترقی اور سیاسی استحکام میں حصہ لیا ہے' سوشل اور رفاہی اداروں کے ذریعہ زبردست تعمیری خدمات سرانجام دی ہیں' مسلم سیاسی جماعتوں کے ذریعہ جمہوریت کے استحکام اور محرومین تک جمہوری حق رسانی کا کام انجام دیا ہے اور اسلامی جماعتوں خصوصاً تبلیغی جماعت اور جماعت اسلامی نے نامساعد حالات میں ملک کی دینی' فکری' اخلاقی' علمی اور عملی فلاح وترقی اور اصلاحِ معاشرہ کے لئے نہایت اہم خدمات انجام دی ہیں' جمعیت علماء اور تعمیر ملت نے اپنے اپنے انداز سے کام کیا ہے اور کرتے آرہے ہیں۔

اسی طرح کئی اہم شخصیتیں جو اپنی ذات اور انفرادیت میں بھی اجتماعیت کی شان رکھتی ہیں' ڈاکٹر سید محمود' مولانا حفظ الرحمٰن' مولانا مفتی عتیق الرحمٰن' مولانا قاری محمد طیب قاسمی' ڈاکٹر فریدی اور آج حال کی دینی شخصیتوں میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا منت اللہ

رحمانی' اسلامی جامعات اور عربی درس گاہیں' علی گڑھ مسلم یونیورسٹی' مسلم فنی اور ٹیکنیکل کالجز' مقامی اور صوبائی تعلیمی سوسائٹیاں' معاشی ادارے اور سماجی انجمنوں کی خدمات بھی بڑی اہمیت رکھتی ہیں' ان سب پہلوؤں کا جائزہ لینا چاہیئے۔ دوسری طرف ان انتہائی تباہ کن مہلک اور دشمنِ اسلام و مسلمین سرگرمیوں کا بھی غیر جانبدارانہ اور مکمل محاسبہ کرنا ضروری ہے' جو آزادی کے بعد سے مسلسل اور غیر منقطع طور پر اسلام اور مسلمانوں کو اس ملک سے بے دخل کرنے یا ان کا نام و نشان مٹا دینے کے لئے جاری ہیں۔ ان میں حکومت و اقتدار میں شامل بعض متعصب اور دشمنِ اسلام عناصر بھی ہیں' بعض نااہل حکام بھی ہیں اور بعض فرض ناشناس اور کاہل کارکن بھی۔ اسی طرح ہندو فرقہ پرست اور مخالف اسلام و مسلمین پارٹیاں بھی ہیں جو بڑی منصوبہ بندی اور سازشوں اور تیاریوں کے ساتھ مسلمانوں کی جان و مال پر حملہ آور ہوتے ہیں' اموال کو لوٹتے' مکانوں اور دکانوں کو جلاتے' لوٹتے' اور مسلمان مَردوں کو ہی نہیں' بلکہ عورتوں اور بچوں تک کو قتل کرنے اور زندہ جلانے کے انتہائی ظالمانہ اور غیر انسانی جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اور اس تناظر میں خاص طور پر اس امر کا تفصیلی جائزہ لینا چاہیئے کہ ایسے فسادات میں حکومت کے ذمہ داروں اور پولیس کا رویہ کیا رہا ہے' کتنے مجرمین کو سزائیں دی گئیں' کتنے قاتلوں کو سزائے موت' پھانسی یا سزائے حبسِ دوام دی گئی اور نام نہاد تحقیقاتی کمیشنوں نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے۔

اس قتل و غارت گری کے علاوہ مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت' ان کے سماج اور ان کی حیثیت عرفی کو ڈائنامیٹ کرنے کے لئے دو چار ملت فروش اور اسلام کے باغیوں کو ساتھ لے کر مسلم پرسنل لاء کو سبوتاژ کرنے کی جدوجہد' اس میں ہندو فرقہ پرست پارٹیوں اور قومی اخبارات سے لے کر ڈسٹرکٹ عدالتوں' ہائی کورٹوں اور سپریم کورٹ تک کے کارناموں کا جائزہ لینا چاہیئے۔

تیسری طرف مسلم اوقاف کو تباہ کرنے' مساجد اور مقدّس مقامات پر قبضہ کرنے اور انہیں مندروں میں تبدیل کرنے کی کوششوں کا بھی جائزہ لینا ضروری ہے۔ آزادی سے لے کر اب تک سینکڑوں' ہزاروں چھوٹے بڑے حادثات میں مساجد وغیرہ پر قبضے کئے جاتے رہے ہیں' بابری مسجد اس کی ایک تازہ مثال ہے۔ حکومت کی چشم پوشی' حکام کی جانبداری بلکہ درپردہ حوصلہ افزائی سے دن بدن ان عناصر کی ہمت افزائی کی جا رہی ہے۔ اور اگر یہی صورت حال جاری رہی تو وہ دن دور نہیں جب کسی ''پروفیسر اور ریسرچ اسکالر'' کی ''تحقیقِ

انیق'' کے نتیجے میں آگرہ کے تاج محل اور دہلی کی جامع مسجد پر بھی کوئی مندر یا تیرتھ یاترا ہونے کا ادعا کیا جائے گا۔ (۱) ''امن'' قائم رکھنے کے لئے ان کی ''تالہ بندی'' کردی جائے گی اور کسی مناسب موقع پر ان کا ''فیصلہ'' کردیا جائے گا' کیونکہ بابری مسجد کے ساتھ جو کھیل کھیلا گیا ہے' وہ کوئی نادر واقعہ نہیں ہے۔ ایسے واقعات کا پتہ لگایا جائے تو کئی حادثات سامنے آئیں گے۔ دُور کیوں جائیں' حیدرآباد سے صرف اڑھائی سو کلومیٹر کے فاصلے پر برہان پور' ضلع شولا پور میں حضرت مخدوم علاؤ الدینؒ کی درگاہ پر جو کہ حضرت خواجہ بندہ نواز رحمۃ اللہ علیہ کے عہد میں دکن میں آئے تھے اور جن کے مزار پر بیجاپور کے عادل شاہی حکمرانوں نے عقیدت سے بڑا عظیم الشان مقبرہ تعمیر کروایا تھا اور جس کے مصارف کے لئے حکومت آصفیہ نظام دکن کی طرف سے ہریالی اور مانے گوپال نامی دو گاؤں عطا کئے گئے تھے' آج اس پر ہندوؤں کا دعویٰ ہے اور شولا پور (مہاراشٹرا) کے ضلعی حکام نے ''امن اور بیچ بچاؤ'' کی خاطر فی الحال تیس پینتیس برس سے اس کی تالہ بندی کر رکھی ہے اور آئندہ کیا قدم اٹھایا جانے والا ہے' بابری مسجد کے فیصلے کی روشنی میں اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ خود حیدرآباد شہر میں مسجد نوبت پہاڑ کا قضیہ زیر دوران ہے۔

جہاں ایک طرف یہ حادثات ہو رہے ہیں' وہیں خاموش طریقے سے مدارس میں درسی کتب اور خصوصاً تاریخ ہند کے اسباق اس طرح مرتب کئے گئے اور پڑھائے جا رہے ہیں جس کے ذریعہ مسلمانوں کے حقیقی کارناموں کو نظرانداز کرنا' ان کو بے وقعت اور بے حقیقت بنا کر پیش کرنا' بلکہ ان کی ایسی صورت گری کرنا ہے کہ مسلمانوں کو محض غاصبوں' ظالموں' لٹیروں اور عیاشوں کے رنگ میں پیش کرنا' اور مسلمان بچوں کا ایسا ذہن بنانے کی سعی کرنا کہ وہ اپنے آباء واجداد کے واقعات پڑھ پڑھ کر نادم وشرمندہ ہو جائیں اور ان میں احساسِ جرم اور احساسِ کمتری کا ذہن پیدا ہو جائے اور ان کی صلاحیتیں ٹھٹھر کر رہ جائیں۔ لہٰذا اس امر کی بھی شدید ضرورت ہے کہ اس چہل سالہ عہد میں ہندی اور دیگر علاقائی زبانوں میں جو درسی کتب تیار کرائی گئیں اور اسکولوں میں وزارتِ تعلیم کی منظوری سے پڑھائی جا رہی ہیں' ان کا تفصیلی جائزہ لیا جائے۔

---

(۱) مقامی اردو انگریزی اخبارات میں کسی انسٹیٹیوٹ برائے دوبارہ تحریر وتدوین تاریخ ہند کے خودساختہ ڈائریکٹر پروفیسر پی این اوک کا بیان شائع ہوا ہے کہ تاج محل ایک ہندو نے بنایا تھا۔
(سیاست ۱۷/اگست ۸۶ء' ص ۳۔ وانڈین ایکسپریس' ص ۱۰)

اسی طرح ہندوستان کے پارلیمانی حلقوں اور مختلف صوبائی اسمبلیوں کے حلقہ ہائے انتخاب میں پچھلے چار پانچ انتخابات کی روشنی میں مسلم ووٹ کی طاقت اور اس کے اثر ونفوذ کا اعداد وشمار کی شہادت کے ساتھ مکمل ومفصل جائزہ لینا چاہئے۔

بہرحال ۱۵/اگست ۱۹۸۷ء کو مسلمانوں کو چاہئے کہ اس موقع کے شایانِ شان جشن کا اہتمام کریں' اس کے لئے تقریباً ایک سال کی مہلت باقی ہے۔ اس غرض سے ''مسلم پرسنل لاء بورڈ'' کی طرح کی ایک نمائندہ اور جامع ''مسلم جشن چہل سالہ کمیٹی'' تشکیل دی جائے' جس میں تمام مسلم جماعتوں' انجمنوں' فرقوں اور زعماء کا اشتراک وتعاون حاصل کیا جائے۔

اس میں سیمینار' جلسہ ہائے عام اور ملک گیر پیمانے پر شہروں' ضلعوں' قصبات اور دیہات تک جلسوں کا اہتمام کیا جائے اور ان کے ذریعے عوام الناس میں مسلمانوں کی ماقبل آزادی کی جدوجہد اور مابعد آزادی اُن کی تعمیری خدمات کا شعور پیدا کیا جائے' انفرادی و اجتماعی ہر شعبۂ زندگی میں' چاہے وہ سیاست ومعیشت کا شعبہ ہو یا معاشرت وتمدن کا' اعداد و شمار کا سروے کر کے رپورٹ تیار کی جائے کہ ملک نے اور خصوصیت سے مسلمانوں نے کیا پایا اور کیا کھویا ہے اور وہ کس مقام پر کھڑے ہیں۔ اس رپورٹ کی روشنی میں یہ فیصلہ کیا جائے کہ اکیسویں صدی کے ہندوستان میں مسلمانوں کا کیا رول ہونا چاہئے اور اس کے لئے مسلمان کیا اور کس طرح تیاری کریں۔ نیز ہندوستان کی حقیقی تعمیر وترقی کے لئے اسلام کا مجوّزہ پروگرام کیا ہے' ملک کے عوام وخواص کے سامنے اسے پیش کیا جائے۔

اگر مسلمان اپنے خیر اُمت ہونے کی حیثیت سے اپنے منصب کو جان لیں' اپنے داعیانہ فریضہ کو پہچان لیں اور ملک کی تعمیر وترقی اور انسانیت کی فلاح ونجات کے لئے جدوجہد پر کمر بستہ ہو جائیں تو سمجھنا چاہئے کہ مسلمانوں کا ہی نہیں خود اس ملک کا مستقبل بھی روشن ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کو یہ جان لینا چاہئے کہ اگلے سال ''جشن چہل سالہ'' وہ اہم موقع ہے جس میں ایک طرف نہ صرف انہیں خود اپنے چالیس سالہ دورِ آزادی کا محاسبہ کرنا ہے' بلکہ اکیسویں صدی کے ہندوستان میں مسلم کردار کو متعین کرنے اور اس کے لئے منصوبہ بندی کرنے کا بھی ان کے لئے موزوں ترین موقع ہے۔ اگر وہ صحیح سمت میں صحیح قدم اٹھاتے ہیں تو علامہ اقبال کے الفاظ میں۔

''میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے''

کی نبوی بشارت کا مصداق بن سکتے ہیں۔

قائدین کرام اور اہل فکر و دانش سے گزارش ہے کہ وہ اس پر سنجیدگی سے غور فرمائیں اور اس کو بروئے کار لانے کے لئے کوئی واضح نقشۂ کار پیش فرمائیں' تاکہ چالیس سالہ دَورِ آزادی کا محاسبہ کیا جا سکے' اور ماضی کے نقوش سے مستقبل کے نقشہ میں رنگ بھرا جا سکے۔

وما توفیقی الا باللّٰہ ۔

اسلامی تاریخ کے مآخذ

ایک مستند ذریعۂ تاریخ

فطرت انسانی اپنے اسلاف کی تاریخ سے فطری دلچسپی رکھتی ہے۔ انسانی فطرت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ اپنے ماضی کی تاریخ کو کریدے' اس کی چھان بین کرے' اس سے رہنمائی حاصل کرے' اپنے حال کے نقشوں کو اور مستقبل کے منصوبوں کو اپنے ماضی کی تاریخ سے مزین اور آراستہ کرے۔ ہر دور کے مؤرخین نے اپنے دور کے اہم واقعات کو منضبط کیا ہے اور اگلی نسلوں کے لئے محفوظ کیا ہے۔ اسی طریقے سے ہم تک جدِّ بنی آدم کے جنت سے سفر کے آغاز سے لے کر اب تک کی مختلف ادوار کی تاریخ پہنچی ہے۔ اس میں ہم تک تاریخ کا جو سب سے اہم مستند اور مبسوط دستاویزی صحیفہ پہنچا ہے وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا لافانی کلام ہے' جس میں نہ صرف یہ کہ واقعات صحت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں' بلکہ جن واقعات کے بارے میں غلط روایات مصلحتاً' یا بعض صورتوں میں عمداً' یا روایات کے تعامل کی وجہ سے رواج پا گئی تھیں ان کی تصحیح بھی کی گئی ہے۔

اسلامی مؤرخین سے پہلے عام طور پر تاریخ سلاطین یا قبائلی سرداروں کے تفاخر کا آئینہ ہوا کرتی تھی یا پھر واقعات مبالغہ اور رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کئے جاتے تھے۔ عوام یا عوامی جدوجہد اور ان کے افکار و خیالات کا ذکر یا تو سرے سے ہوتا ہی نہیں تھا' یا اگر ہوتا تھا تو وہ صرف رنگ آمیزی کے لئے۔

اسلامی مؤرخین نے اس قدیم ڈگر سے ہٹ کر عوامی رُخ اختیار کیا۔ سماج میں جو فکری اور نظریاتی تحریکات اٹھیں' اور جن کے اثرات اجتماعی زندگی پر پڑے اور جو انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں' انہوں نے اس جانب بھی توجہ دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تاریخ میں جہاں خلفاء یا سلاطین کا ذکر ہوتا ہے وہیں عوام کی سوچ اور فکر کے مختلف مکاتب کی تاریخ کو

D:\Ma-2005\Meesaq_Pdf_2005\meesaq february05\ms04-01.inp 8/22/2014 3:38 PM PAGE 6 (1,1)

بھی محفوظ کیا گیا ہے۔ اس تاریخی مواد میں جہاں حکمرانوں کے عدل و انصاف یا کارناموں اور اصلاحات کا تفصیلی تذکرہ ہے وہیں ایسے لوگوں کا بھی پورا پورا حال درج ہے جنہوں نے بے باکی کے ساتھ حکمرانوں کو غلط کام کرنے' یا صراطِ مستقیم سے ہٹ کر معاملاتِ حکومت انجام دینے پر برسرِ عام ٹوکا ہے اور ہمیشہ اس بات کی کوشش کی ہے کہ معاشرہ غلط راہوں پر گامزن نہ ہو۔ حکمرانوں کے جبر و استبداد کے باوجود ایسی تحریکات بھی اٹھی ہیں جن کے ذریعہ عوام کو صحیح فکر کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔ ایسی فکری تحریکات انقلاب کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوئی ہیں۔

مؤرخین کے نزدیک انسانی تاریخ کے مآخذ زیادہ تر وہ قصے کہانیاں ہیں جو توریت' زبور' انجیل' رگ وید' یجروید' سام وید' تمروید' مہا بھارت' جٹکا کہانیاں اور بنی اسرائیل کے قصص علماء کے ذریعے آنے والی نسلوں کے سپرد ہوئیں' یا ماہرینِ آثار قدیمہ نے سائنسی بنیادوں پر بنی نوعِ انسان کی تاریخ کی جستجو میں مختلف غاروں اور کھدائی کے دوران برآمد ہونے والے انسانوں کے مختلف النوع ڈھانچے' اعضاء' جبڑے اور کھوپڑیوں کے ذریعے انسانی تاریخ کے آثار و قرائن کی تلاش کی' یا کھدائی کے دوران قدیم زمانے کے کتبات' مورتیاں' برتن اور سکّے وغیرہ برآمد ہوئے۔

انگریز مؤرخین ایچ جی ویلز' ایڈورڈ نال' برنسز فلپ لی' ہویل اور ڈاکٹر سچر یڈر' انفسٹن وغیرہ مشہور و معروف مؤرخین نے بھی اپنی تاریخی ریسرچ کی بنیاد ان ہی مآخذ پر رکھی ہے۔ زبور' توریت اور انجیل کی ترتیب و تسوید موجودہ تحقیقی معیار پر پوری نہیں اترتی اور ان کا روایتی استناد محتاجِ تصدیق ہے۔ ان کتابوں کے راوی مجہول النسب بھی ہیں اور مجہول الحال بھی۔ ان کے تیسرے اور چوتھے راویوں کا صحیح علم اب تک عیسائی اور یہودی دنیا کو نہیں ہو پایا ہے۔ اسی طرح وید اور آریائی مآخذ کی سند کا مسئلہ ہے۔ اسی طرح مہا بھارت' کوشیلیا کا ارتھ شاستر' منوسمرتی اور جٹکا کہانیاں اپنی سند کے لحاظ سے وقیع اور مستند قرار نہیں دی جاسکتیں۔ گو ان مآخذ سے پراچین تاریخ کے کچھ آثار و قوانین کا اندازہ ضرور لگایا جاسکتا ہے۔ ان میں صحیح و غلط روایات گڈمڈ ہو گئی ہیں۔ خاص طور سے آسمانی کتابوں' جیسے انجیل' تورات' زبور میں خدائی کلام اور انسانی کلام کو ممیّز کرنا مشکل ہے کیونکہ یہ کتابیں ان انبیاء کے صدیوں بعد ان کے صحابہ اور حواریین نے اپنی یادداشت کی بنا پر لکھی ہیں۔ قرآن خود اس پر شاہد ہے کہ عیسائیوں نے ان میں من مانی تحریفات کی ہیں اور تاویلات میں بھی توڑ مروڑ کر اور مسخ کر کے رکھ دیا ہے' اس لئے بنی اسرائیل کے قصص اپنی اسناد کے لحاظ سے مستند نہیں ہیں' ان میں رطب

ویا بس سب موجود ہے۔قرآن پاک نے بہت سے واقعات کی اصلاح کی ہے۔اسی طرح ویدک روایات کا حال ہے۔

بلاشبہ کچھ روایات' قصے اور واقعات تواتر سے ایسے ضرور ملتے ہیں جن میں کچھ مشابہت ضرور پائی جاتی ہے۔مثال کے طور پر حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ ہے' جن کو آدمِ ثانی کا لقب دیا جا سکتا ہے۔ابن سعد نے لکھا ہے کہ بابل ماضی بعید میں انسانی تمدن کا سب سے بڑا گہوارہ تھا۔یہ وہ اوّلین مقام تھا جسے نوح علیہ السلام کے بیٹے یوناطن نے طوفانِ نوح کے جانے کے بعد آباد کیا' یوناطن اور ان کے بھائی سام بن نوح ایک ساتھ رہتے تھے۔بابل کی آبادی کے بعد سام شام کی طرف چل پڑے اور ملک شام ان ہی سے موسوم ہوا۔(ابن سعد' جزاول' صفحہ ۱۸)

المسعودی نے وثوق کے ساتھ یہ دعویٰ کیا ہے کہ یبصر جو آدم کی اولاد میں سے تھا' مصر کا بانی ہے اور یہ بات نئی تحقیق سے ثابت ہوگئی ہے۔(المسعودی' جز۲' ص۱۴۲)

ہندوستان کی قدیم مذہبی کتابوں میں تواتر سے ایک واقعہ ملتا ہے جو حضرت نوح علیہ السلام سے ملتا جلتا ہے اور اس میں کافی مشابہت پائی جاتی ہے۔

کیتھ پاتھ برہمنا میں جو رگ ویدک کی تشریح سے ایک کہانی بیان کی گئی ہے کہ منو مہاراج کو ایک مچھلی نے اطلاع دی کہ ایک خطرناک سیلاب آنے والا ہے' وہ ایک بڑی کشتی تیار کریں اور سیلاب کے وقت اس کشتی میں سوار ہو جائیں۔سیلاب اژدہے کی طرح پھنکارتا ہوا آن پہنچا اور ہر شے زیروزبر ہوگئی۔منو مہاراج جلدی سے کشتی میں سوار ہو گئے۔سیلاب اس قدر منہ زور تھا کہ اس نے ہر بلندی کو چھولیا' اور منو مہاراج کی کشتی ہمالیہ کی اونچی سے اونچی چوٹی پر چڑھ گئی۔(اے دبّر میٹیڈ یز' جلد اول' ص۱۶۱)

اے دبّر نے کیتھ پاتھ برہمنا سے جو کہانی نقل کی ہے ویسی ہی کہانی عرب اور اسرائیلی لٹریچر میں تسلسل اور تواتر کے ساتھ موجود ہے۔ان روایات کے مطابق سیلاب نے جب خطرناک شکل اختیار کر لی تو نوح علیہ السلام کی کشتی موصل کی ایک پہاڑی جودی پر ٹھہر گئی اور سیلاب اترنے کے بعد حضرت نوح علیہ السلام جودی کے دامن میں کچھ دیر رک کر بابل کی طرف آ گئے اور ان کے بیٹوں نے بابل آباد کیا جو بہت عرصہ تک انسانی تمدن کا گہوارہ رہا ہے۔ قرآن مجید نے پوری تفصیل سے حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ بیان کیا ہے۔

ہمارے کہنے کا مدعا یہ ہے کہ ان تمام قدیم تاریخی مآخذ کے مقابلے میں قرآن زیادہ مستند ماخذ ہے۔قرآن حکیم میں پہلی اُمتوں' پہلے انبیاء اور پچھلے ادوار کے قصے بیان فرمائے

گئے ہیں۔ اس لئے قرآن حکیم ہی نے پہلے عرب مؤرخین امام شعبیؒ، امام مالکؒ امام ابن اسحاقؒ، ابن ہشامؒ، ابن سعد حتیٰ کہ امام الواقدیؒ، الطبری، ابن الندیم، البلاذری، ابن اثیر، ابن کثیر، عبدالرحمٰن، ابن خلدون، ابوالفداء، الہسیلی، الخرائطی اور دوسرے ائمہ اور علماء کو تاریخ نویسی کی طرف متوجہ کیا۔ ہمارے نزدیک قرآن حکیم اسلامی تاریخ کی اوّلین اساس تو یقیناً ہے ہی، اسے ایک مبسوط و منضبط تاریخ کا محرک بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

مؤرخ ابن الندیم، صاحب ''الفہرست'' کا دعویٰ غلط نہیں ہے کہ عباسی خلیفہ مامون الرشید اور اس کے عہد کے عرب مؤرخین ہی تھے جنہوں نے یونان کی گم گشتہ گرجوں کے تہہ خانوں میں مدفون یونانی علوم و فنون کو سونے کے بھاؤ خریدا اور مامون الرشید نے کئی جہاز سونے سے بھر کر رومی اور یونانی ساحلوں پر بھجوائے۔ رومی اور یونانی گرجوں کے لاٹ پادریوں نے ان کے تہہ خانوں میں مدفون کرم خوردہ کتابوں کے انبار کے انبار ترازو کے ایک پلڑے میں رکھے اور دوسرے پلڑے میں سونا رکھا گیا، یوں منوں بوجھل یہ علمی ذخیرے روم اور یونان سے بغداد لائے گئے اور پھر ان کی ایڈیٹنگ بھی کی گئی اور ان کا ترجمہ بھی۔ اور جن لوگوں نے یہ کام کیا ان کو ماہانہ اسّی اشرفیاں اور اسّی پونڈ سونا عطا کیا گیا۔ (الفہرست، ابن الندیم، نسخۂ قدیم، ص ۱۶۔۱۴)

اس مثال سے مسلمانوں کی علم دوستی اور فلسفہ و تاریخ سے شغف کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی دور کے مسلمان علماء و مؤرخین نے یونانی حکیموں اور مؤرخین کو پوری دنیا سے متعارف کرایا اور اس فلسفۂ تاریخ کو دیانت کے ساتھ پیش کیا اور ہر طرح علمی و تحقیقی کاموں کا حق ادا کیا۔ اس لئے وثوق سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ عرب مؤرخین کی تاریخی تالیفات حد درجہ معیاری اور انتہائی مستند ہیں اور ان میں مندرج روایات کا پایۂ استناد بہت اونچا ہے۔

ہم نے یہ تذکرہ اس لئے کیا ہے کہ اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ قیاسی نہیں، بلکہ واقعاتی ہے، اس کو سند اور تحقیق کی ہزاروں کسوٹیوں پر بھی اگر پرکھا جائے تو یہ غلط ثابت نہ ہوگا۔ اس کے برعکس انگریز اور امریکی مؤرخین و محققین کے تحقیقی تاریخی واقعات کو دیکھا جائے تو اپنی سند کے لحاظ سے بہت کمزور ثابت ہوں گے، اسی لئے انگریز مؤرخ ایچ جی ویلز نے کہا ہے کہ ایک ہزار سال پہلے تک انسانی تاریخ محض قصے کہانیوں اور قیاس آرائیوں تک محدود تھی۔ انسانی زندگی کا آغاز اچانک ہوگیا۔ انسانی زندگی کے آغاز کی کوئی تاریخی شہادت موجود نہیں ہے۔ (ایچ جی ویلز، اے شارٹ ہسٹری آف ورلڈ، ص ۱، مطبوعہ کیسیل اینڈ کمپنی)

اسی کسوٹی پر اگر ہندوستانی مؤرخین اور محققین کو جانچا اور پرکھا جائے تو وہ اپنی تحقیقات میں قیاسات کے اٹکل پچو چلاتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔اس پر ستم بالائے ستم یہ کہ علمی تحقیق کے بجائے انہوں نے عصبیت کی عینک بھی اپنی آنکھوں پر چڑھا رکھی ہے۔اس کے نتیجہ میں ایسے ایسے انکشافات کر رہے ہیں کہ عقل بھی دنگ رہ جائے۔ ؎

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے!

خاص طور سے اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کو توڑ مروڑ کر اس انداز سے پیش کیا جا رہا ہے کہ علم و تحقیق کے تمام معیار ماند پڑ گئے ہیں۔ایسے تحقیقی اداروں کو نہ صرف یہ کہ اکثریت کی تائید و حمایت حاصل ہے' بلکہ ان کو حکومت کی سرپرستی بھی حاصل ہے اور حکومتی فنڈ سے لاکھوں روپوں کی امداد ان کو دی جا رہی ہے تا کہ پراچین سبھتا کے نام پر وہ نئے نئے گل کھلاتے رہیں اور دور کی کوڑی ڈھونڈ ڈھونڈ کر لائیں۔تاویلات کا ایک سلسلہ ہے جو چل پڑا ہے۔

کسی معاشرے کی تجدید نو اور احیاء کے لئے تاریخ کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔تاریخ کے اسباق پر تدبر کیا جائے' آیاتِ تاریخ سے سرسری طور پر نہ گزرا جائے' اس لئے کہ کوئی انقلاب تاریخ کے پسِ منظر ہی میں رونما ہوتا ہے' اس کی ایک تاریخی اساس ہوتی ہے۔محض نعرہ بازی کسی انقلاب کا پیش خیمہ ہرگز نہیں ہو سکتی۔انقلاب کی تمہید کو مضبوط کرنے کے لئے کتنے ہی نوجوانوں کے بال سفید ہو جاتے ہیں' تب کہیں جا کر ایک نئی فکری صبح طلوع ہوتی ہے۔ہمارے نوجوانوں کو فکر و تدبر کی ایسی قندیلیں روشن کرنی چاہئیں جن کا نور معاشرے کو تاریکیوں سے نکال کر یکا یک سحر کی جگمگاتی فضا میں لا بسائے۔ہمیں تاریخ کے مختلف پہلوؤں' مختلف تہذیبوں کی تاریخ اور خاص طور پر اسلامی تاریخ کے عروج و زوال کے ادوار کو پیش نظر رکھنا چاہئے' تا کہ ہم دیکھ سکیں کہ ہم نے کیا اچھے کام کئے ہیں جن کے نتیجہ میں عروج حاصل ہوا اور کہاں لڑکھڑائے ہیں' جس کی پاداش میں زوال کی پستیوں میں دھکیل دیئے گئے۔اور ہم یہ دیکھ سکیں کہ آج ہم کس طرح عروج حاصل کر سکتے ہیں' وہ کیا اسباقِ تاریخ ہیں جن کو پڑھ کر ہم ہوا کے رُخ کو پھیر سکتے ہیں۔یہی وہ سبق ہے جس کی طرف حکیم الامت نے نوجوان نسل کو توجہ دلائی تھی ؎

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے؟
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اِک ٹوٹا ہوا تارا!

قوموں کے عروج وزوال میں تاریخ کا عمل

مفکر اسلام علامہ ڈاکٹر محمد اقبال نے کہا ہے کہ ''جس طرح فرد کی زندگی میں حافظہ کی اہمیت ہے' یہ اگر کم ہو جائے یا گم ہو جائے تو اس کی زندگی بے معنی ہو جاتی ہے' اسی طرح کسی قوم اور ملت کی زندگی میں تاریخ کی اہمیت ہے۔ اگر کسی قوم وملت کی تاریخ گم ہو جائے یا پردۂ گم نامی میں چلی جائے تو اس کی حیاتِ ملی بھی بے معنی ہو جاتی ہے''۔

تاریخ کسی قوم کے ماضی کا اثاثہ ہے' جس کی اساس پر حال کی تعمیر کی جاتی ہے اور مستقبل کا راہِ عمل متعین کیا جاتا ہے۔ کسی قوم کا ماضی اگر گمشدہ ہو تو حال کے نقشوں میں رنگ نہیں بھرا جا سکتا اور مستقبل کے نقشۂ حیات پر سیدھی لکیریں نہیں کھینچی جا سکتیں۔

قرآن حکیم نے بار بار تاریخ پر نظر ڈالنے پر زور دیا ہے اور تاریخ کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ قرآن پاک نے آیات اور مشاہدۂ آیات کی بار بار توجہ دہانی کرائی ہے۔ زمین و آسمان اور آفاق وانفس کے ہر گوشہ میں نشانیاں ہیں' جو خدا کی قدرت وحکمت' اس کی توحید اور اس کے قانون جزا وسزا اور قوموں کے عروج وزوال' بناؤ وبگاڑ کی گواہی دے رہی ہیں۔ اور یہی وہ آیات ونشانیاں ہیں جن کو آثارِ کائنات اور آیاتِ تاریخ کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ان ہی آثارِ کائنات اور آیاتِ تاریخ پر غور کرنے کی انسان کو بار بار دعوت دی گئی ہے' ان سے فائدہ اٹھانے پر زور دیا گیا ہے' اور بتایا گیا ہے کہ کون لوگ ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں:

﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ﴾ (الجاثیۃ)

''ان میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو غور وفکر کرتے ہیں''۔

یعنی جو لوگ آثارِ کائنات اور آیاتِ تاریخ پر غور کرتے ہیں وہ ان میں بڑے فوائد پاتے ہیں اور اپنی زندگیوں کے سدھار اور استوار کے لئے ان کے اندر بڑے سامان ہیں۔ جس قوم نے ان آیاتِ تاریخ پر غور کیا' ان کو اپنی زندگی کی اساس بنایا' ان میں تدبر کیا' ان کی روشنی میں اپنے حال کو سنوارا' انہوں نے اپنے مستقبل کو تابناک بنا لیا' ان کو تفوق وبرتری حاصل ہوئی' ان کے نام کا ڈنکا چہار دانگ عالم میں بجنے لگا۔ جن قوموں نے ان آیاتِ تاریخ کو نظر انداز کر دیا' تاریخ کے اسباق کو پسِ پشت ڈال دیا' قوموں کے عروج وزوال کی داستانوں سے اپنے لئے عبرت پذیری کا سامان بہم نہ پہنچایا اور یہ سبق حاصل نہ کیا کہ کوئی قوم بامِ عروج پر کس رویۂ زندگی سے پہنچتی ہے اور کس طرزِ حیات سے قعرِ مذلّت میں جا گرتی ہے' ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ ان کے اندر انحطاط پیدا ہونے لگا اور وہ گمنامی کے پردے میں چھپ گئیں۔

سورۃ المعارج کی آیت ۴ میں اللہ تعالیٰ نے انسانی تاریخ کے پچاس ہزار برس کو ایک دن قرار دیا ہے۔ کسی قوم کے اعمالِ نیک و بد کا فوری نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ کسی قوم کی غلطی کی سزا فوراً نہیں ملتی۔ کسی معاشرے کے اعمالِ حسنہ اور اعمالِ سیّئہ کا شجر فوری طور پر برگ و بار نہیں لاتا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی تالاب میں ایک پتھر پھینکتا ہے تو اس میں بڑا ارتعاش پیدا ہوتا ہے، بڑی بڑی لہریں اٹھتی ہیں، لیکن اگر دریا رواں ہو، سمندر موجیں مار رہا ہو اور اس میں پتھر پھینکا جائے تو محسوس بھی نہیں ہوتا کہ اس میں کوئی پتھر پھینکا گیا ہے، اگر ارتعاش پیدا بھی ہوتا ہے تو نظر نہیں آتا۔ قافلۂ زندگی جامد و ساکت نہیں ہے۔ زندگی موجِ دریا کی طرح رواں دواں ہے، اس میں ارتعاش پیدا کرنے کے لئے بڑی قوت کی ضرورت ہے، بڑی تگ و دو کی ضرورت ہے، اور اس تگ و دو کے لئے ماضی (تاریخ) سے ہی رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔

سورۃ العصر میں اللہ تعالیٰ نے تاریخ، وقت اور زمانے کی قسم کھائی ہے، ہر آن آ کر مستقبل کو حال اور جا کر حال کو ماضی بنا رہا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس آیت کے ترجمہ میں واضح کیا ہے کہ زمانہ مع اپنی پوری انسانی تاریخ کے گواہ ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے تاریخ کی شہادت دلائی ہے، تاریخ کو گواہ ٹھہرایا ہے۔ دوسرے معنوں میں تاریخ خدا کے عمل کا نام ہے۔ آیاتِ الٰہی اس کے اقوال ہیں تو آیاتِ تاریخ اس کے اعمال ہیں۔ یہ قانونِ الٰہی ہے کہ جب کوئی قوم قدرت کے لگے بندھے ضابطوں کی پابندی کرتی ہے تو وہ عروج پر پہنچتی ہے، اور جب ان ضابطوں کے مطابق عمل کرنا چھوڑ دیتی ہے تو زوال اس کا مقدر ہو جاتا ہے۔ اس لئے جو قومیں تاریخ سے لڑنے کی کوشش کرتی ہیں کامیابی ان کا حصہ نہیں بنتی، وہ زوال اور گمنامی کی طرف دھکیل دی جاتی ہیں۔

آج ہم اپنی ملی تاریخ میں ایک نازک موڑ پر کھڑے ہیں اور اپنے آپ کو سنبھالا دینے کی سعی میں مصروف ہیں۔ ہمیں اپنے قومی کردار کو بچانا، اسے بنانا اور آگے بڑھانا ہے۔ آج جبکہ سارے تاریخی عوامل کام کر رہے ہیں جو کسی بھی قوم کے عروج و زوال کے لئے انتہائی اہمیت رکھتے ہیں، اس موڑ پر ہمیں تمام چیزوں کو بھلا کر اپنے تاریخی اثاثے کی حفاظت کرنی ہے اور ان تمام شر پسند عناصر کی کوششوں کو پارہ پارہ کرنا ہے جو ہماری تاریخ سے ہمارا رشتہ توڑنے کے لئے پیہم کوشاں ہیں، جو ہماری مذہبی، تاریخی اور ثقافتی اساس کو پارہ پارہ کرنے میں کوشاں ہیں۔ اگر ہم اس موقع پر غافل رہے اور تاریخ کے اتار چڑھاؤ پر نظر نہ رکھی تو یاد رہے ؎

فطرت افراد سے اغماض تو کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملّت کے گناہوں کو معاف!

تدوینِ تاریخ مسلمانانِ ہند

ایک خاکہ' ایک عظیم مقصدی منصوبہ

اسلام کا دور ہندوستان میں ہمیشہ مثبت اور تعمیری رہا ہے' اس نے اس ملک کو روحانی اور اخلاقی طور پر بھی مالا مال کیا ہے اور مادی حیثیت سے بھی زبردست فائدے پہنچائے ہیں' اور یہاں کی انفرادی اور قومی زندگی کے ہر شعبے پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی کوئی معیاری' حقیقی اور مفصل تاریخ مرتب نہیں کی گئی۔ انگریزوں نے اپنے سیاسی اور اسلام دشمن مقاصد کی خاطر اسے مسخ کر کے پیش کیا ہے اور غیر ہی نہیں خود اسلام کے نام لیوا بھی بڑی حد تک اس سے ناواقف اور غافل ہیں' لیکن اس ملک کے چپے چپے پر اس کی نشانیاں روشن ہیں اور یہاں کی زندگی کے ہر شعبے میں اس کے گہرے اثرات پڑے ہیں' جو آج بھی نمایاں نظر آتے ہیں' ہندوستانی سماج کا کوئی شعبہ اس کی چھاپ سے محروم نہیں ہے۔

نئی نسلوں کی تعلیم و تربیت اور کردار سازی میں تاریخ بہت اہم پارٹ ادا کرتی ہے۔ بزرگوں کی پاکیزہ سیرت اور ان کی علمی' دینی و سماجی خدمات اور فتوحات و بہادری کے اعلیٰ کارنامے بچوں کے دل و دماغ پر گہرے اثرات ڈالتے ہیں' ان کے مطالعے سے بچوں میں نئی اُمنگیں' نیک جذبات' بلند عزائم و حوصلے اور جوش و ولولے پیدا ہوتے ہیں' اس لئے بچے چاہے سائنس پڑھیں یا انجینئرنگ' ٹیکنیکل تربیت حاصل کریں چاہے کوئی فن و حرفت سیکھیں' تاریخ کا مطالعہ ان کی تربیت کے نقطۂ نظر سے ضروری ہے۔ ماضی کے نقوش سے ہی وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مستقبل کا لائحہ عمل مرتب کر سکتے ہیں۔ وہ نقوش ہی اگر مدھم ہوں تو مستقبل کے لائحہ عمل کے لئے روشنی کا مینار ثابت نہ ہو سکیں گے۔

یوں تو ہندوستان میں پچھلے سوا سو سال سے (یعنی پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد سے) اسلام پر طرح طرح کے حملے کرنے اور اس کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کا سلسلہ جاری ہے اور مسلمانوں کی تاریخ کو غلط طریقے سے پیش کیا جاتا رہا ہے' جس کی طرف علامہ شبلی نعمانی نے ایک شعر میں یوں اشارہ کیا ہے:۔

انہیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ عالمگیر ہندوکش تھا' ظالم تھا' ستم گر تھا

لیکن آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کو مسخ کرنے اور ان کے کارناموں کو چھپانے اور ان کی غلطیوں کو نمایاں کرنے' بلکہ بڑھا چڑھا کر پیش کرنے اور اچھالنے اور ان کے ماضی کے خلاف شرانگیز پروپیگنڈا کرنے کی زبردست کوششیں کی جاتی رہی ہیں اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ تاریخ کے پہلو سے مسلمانوں کے خلاف ایک طرح کی منظم اور منصوبہ بند کوششیں کی جاتی رہی ہیں کہ مسلمانوں کے افکار و خیالات' عقائد و نظریات اور تہذیب و تمدن کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جائے اور ان کو بھیانک روپ دیا جائے' اسلام کی تعلیمات کو بھی بگاڑ کر پیش کیا جائے' ان کے اہم آثار اور کارناموں کو ہندوؤں کے کارنامے ثابت کیا جائے اور مسلمانوں کو محض ایک ظالم' لٹیری اور مجرم قوم ثابت کیا جائے۔ خود حکومت کے منظور کردہ نصابِ تعلیم میں جو مدارس میں پڑھایا جاتا ہے' مسلمانوں کی تاریخ اس ڈھنگ سے پڑھائی جاتی ہے جس سے مسلمان بچوں میں احساسِ کمتری (Inferiority Complex) پیدا ہو جائے اور انہیں اپنی تاریخ سے نفرت ہو جائے' اور اپنے بزرگوں کے خلاف جذبات پیدا ہو جائیں' جس کے بعد انہیں ان کے ماضی سے کاٹنا آسان ہو جائے اور اکثریتی تہذیب میں ضم کرنے کے راستے ہموار ہو سکیں' یا اگر ضم نہ بھی ہوں تو کم از کم مسلم بچوں میں احساسِ کمتری' پست ہمتی اور شکست خوردگی کا ذہن نشو و نما پائے اور وہ ہندو قوم سے آنکھیں چار کرنے سے شرمانے لگیں۔

ہندوستان میں پچھلے چالیس سال سے یہ حالات اور زیادہ نمایاں ہیں اور اس کے افسوسناک و خطرناک اثرات نمودار بھی ہو رہے ہیں۔ ان حالات میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف منصوبہ بند اور منظم کوششوں کا مقابلہ کرنا ہر ہندی مسلمان پر بقدر استطاعت واجب ہے۔ یہ محض مسلمان کی عرفی حیثیت (Reputation) اور دین و تہذیب کی حفاظت کا مسئلہ ہی نہیں ہے' بلکہ مسلمان نسلوں کی تعلیم و تربیت اور تعمیر سیرت کے لئے بھی اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ:

> ''ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ایک مستند جامع اور بڑی حد تک مکمل و مفصل تاریخ مرتب کی جائے' جس میں واقعات کی تحقیق بھی ہو' فن تاریخ نگاری کے لحاظ سے معیاری بھی ہو اور اس اسلوب سے مرتب کی جائے کہ اپنوں کے ذہن و فکر کو روشنی عطا کرے اور غیروں کی غلط فہمیوں کو دور کرے اور مخالفین کے پروپیگنڈے کا ناقابل تردید جواب ثابت ہو' اور سب سے بڑھ

کر یہ کہ مسلمان نسلوں کے ذہن وفکر اور سیرت و کردار کی تعمیر و تربیت کا مؤثر ذریعہ ثابت ہو۔''

آزادی کے بعد پچھلے چالیس برسوں میں مسلمانوں نے حکومت کے اندر بھی اور باہر بھی، قومی سیکولر جماعتوں کے ذریعہ بھی ملک کی مادّی ترقی اور سیاسی استحکام میں حصہ لیا ہے، سوشل اور رفاہی اداروں کے ذریعہ زبردست تعمیری خدمات انجام دی ہیں، مسلم سیاسی جماعتوں کے ذریعہ جمہوریت کے استحکام اور جمہوری حقوق رسانی کا کام انجام دیا ہے اور آزادی کے بعد مسلمان جس مایوسی، قنوطیت، دل شکستگی اور خوف و ہراس اور نا اُمیدی و محرومی کے شکار ہو گئے تھے، مسلمانوں کی جماعتوں اور تنظیموں نے مسلمانانِ ہند کو اس دلدل سے نکالنے کی کوششیں کی ہیں۔ اس پہلو سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ آزادی کے فوراً بعد وہ کیا اسباب وعلل اور محرکات تھے جن کا اثر مسلمانوں پر پڑا، پھر اِس کا بھی جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ مسلم جماعتوں نے اس ضمن میں مختلف پہلوؤں سے کیا کیا خدمات سرانجام دی ہیں اور اس مقصد کے لئے کن کن مراحل سے ان کو گزرنا پڑا ہے، ذہن وفکر کے علاوہ عملی میدان میں کیسی کشمکش سے انہیں دوچار ہونا پڑا ہے۔

ان انتہائی تباہ کن، مہلک اور دشمن اسلام و مسلم سرگرمیوں کا بھی غیر جانبدارانہ اور مکمل محاسبہ کرنے کی ضرورت ہے جو آزادی کے بعد سے مسلسل اور غیر منقطع طور پر اسلام اور مسلمانوں کو اس ملک سے بے دخل کرنے یا ان کا نام ونشان مٹا دینے کے لئے جاری ہیں۔ ان میں حکومت واقتدار میں شامل بعض متعصب اور دشمنِ اسلام عناصر بھی ہیں، بعض نااہل حکام بھی ہیں اور بعض فرض ناشناس اور کاہل کارکن بھی، اسی طرح ہندو فرقہ پرست اور ہندو احیاء پرست اور دشمن اور مخالف اسلام و مسلمین پارٹیاں بھی ہیں، جو بڑی منصوبہ بند سازشوں اور تیاریوں کے ساتھ منظم طور پر مسلمانوں کی جان ومال پر حملے کرتے، اموال لوٹتے، مکانوں اور دکانوں کو لوٹتے اور جلاتے اور مسلمان مردوں کو ہی نہیں بلکہ عورتوں اور بچوں تک کو قتل کرتے اور زندہ جلانے کے انتہائی ظالمانہ اور غیر انسانی جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات میں حکومت کے ذمہ داروں اور پولیس کا رویہ بھی غیر جانبدارانہ اور فرقہ وارانہ ہوتا ہے۔ ایسے انسانیت سوز اور ہلاکت انگیز فسادات کے بعد کتنے مجرمین کو سزائیں دی گئیں، کتنے قاتلوں کو سزائے موت، پھانسی یا سزائے حبس دوام دی گئی اور نام نہاد تحقیقاتی کمیشنوں نے کیا کارنامہ انجام دیا؟ فرقہ پرستی کی تاریخ، اس کے اسباب ومحرکات، جذبات و

داعیات کا جائزہ لینا ہوگا کہ اس کی نشو ونما کس طرح ہوئی اور کون کون سے ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے پروان چڑھی' جبکہ آج پورا ملک فرقہ پرستی اور تشدد کی لپیٹ میں ہے' فرقہ پرستی اور تشدد کا بھیانک دیو ہر جگہ ننگا ناچ رہا ہے۔ یہ فرقہ پرستی قومی بھی ہے' مذہبی بھی ہے اور لسانی اور تہذیبی روپ بھی رکھتی ہے' جس نے ملک میں نفرت وعناد' علیحدگی پسندی اور علاقائی عصبیتوں کو جنم دیا ہے۔ تامل باشندوں کی ہندی کے خلاف نفرت' سکھوں کی خالصتان کی تحریک تشدد' گورکھا لینڈ کی علاقائی تحریک' ہندو پریشدوں اور ترشول دھاری تنظیموں اور اسی قبیل کی بہت سی تحریکات نے فرقہ پرستی کی کوکھ سے ہی جنم لیا ہے۔ یہ فرقہ پرستی تاریخی تسلسل بھی رکھتی ہے' مسلمانوں کے تعلق سے تو یہ جارحانہ روپ دھارن کر چکی ہے' اس لئے اس کی گہرائی سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے' تاکہ اس کے سدّ باب کی راہیں تلاش کی جاسکیں' ورنہ خطرہ ہے کہ ملک اس کی آگ میں بھسم ہوکر رہ جائے گا اور ملک کا انگ انگ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جائے گا۔ ملک میں ہونے والے فسادات کا سروے کیا جائے۔ ملک کے کن کن مقامات اور حصوں میں ۱۹۴۷ء کے بعد کتنے فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ہیں؟ ان فسادات کے اسباب ومحرکات کیا تھے؟ ان فسادات میں جانی اور مالی کتنے نقصانات ہوئے ہیں؟ اس کے اثرات اخلاقی' تہذیبی اور اقتصادی طور پر کیا کیا پڑے ہیں؟ نفرت وعداوت کی کیسی چنگاریاں بھڑکی ہیں؟ اخلاق وشرافت اور انسانیت کا کیسا جنازہ نکلا ہے؟ دھارمک جلسے اور جلوس اور رتھ یاتراؤں کا سلسلہ' اشتعال انگیز نعرے' مذہبی جنون کا پرتشدد مظاہرہ اور جارحانہ کارروائیوں نے کیسے کیسے گل کھلائے ہیں؟ اور فساد پھوٹنے کے بعد انتقام در انتقام کا سلسلہ اور کرفیو کے دوران پولیس کی یکطرفہ کارروائیاں' ان تمام پہلوؤں کے لحاظ سے سروے کرنا ہوگا' اور اس کا جائزہ لینا ہوگا۔

تعلیمی مسئلہ : تعلیمی میدان میں مسلمانوں کی پیش رفت اور مسابقتی امتحانات میں ان کے ساتھ امتیازی سلوک کا بھی جائزہ لینا ہوگا کہ مسلمانوں نے تعلیمی لحاظ سے کیا پیش رفت کی ہے اور اس میدان میں آگے بڑھنے کے لئے کیا رکاوٹیں' اور موانعات ان کو پیش آتی رہی ہیں۔

ملازمتوں کا مسئلہ : سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا کیا تناسب رہا ہے اور مسلمانوں کے لئے سرکاری ملازمتوں کے دروازے کیوں بند رہے ہیں' اس میں کس کس طرح کے امتیازات برتے جاتے رہے ہیں اور کس طرح مسلسل ان کو پیچھے دھکیل دینے کی

کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔

اردو کا مسئلہ : مسلمانوں کی مادری زبان اردو کے ساتھ حکومت کا رویہ کیسا بھیانک رہا ہے اور ایک جانی بوجھی پالیسی کے تحت مسلمانوں کو ان کی مادری زبان سے محروم کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ تعلیمی نظام کو چابک دستی سے ایسا مرتب کیا گیا ہے کہ مسلمان اپنی مادری زبان سے بھی بے بہرہ ہو کر رہ جائیں۔ اردو کے ساتھ سوتیلے پن کا سلوک کیا گیا ہے۔ ان تمام پہلوؤں کے لحاظ سے سروے کرنے' جائزہ لینے' تحقیقاتی رپورٹ تیار کرنے اور اعداد و شمار تیار کرنے کی شدید ضرورت ہے۔

عبادت گاہوں کا مسئلہ : ہندوستان میں مسلمانوں کی بے شمار عبادت گاہیں اور مساجد ہیں جو مسلم بادشاہوں کی تعمیر کردہ ہیں' جو تاریخی یادگار اور آثار قدیمہ کی حیثیت رکھتی ہیں' جو صدیوں سے عبادت کے لئے استعمال کی جاتی رہی ہیں۔ سالہا سال سے ان پر مسلمانوں کا قبضہ و تصرف رہا ہے اور اوقات کے تحت بھی درج رجسٹر ہیں۔ فرقہ پرستوں نے ایسی کتنی ہی مساجد کی بازیابی کی مہم چلا رکھی ہے۔ تاریخ کی من مانی تاویلات کے ذریعہ ان مساجد کو قدیم ہندو یادگار یا ہندو مندروں سے تعبیر کیا جاتا ہے اور مفروضہ مقاصد کے لئے کتنی ہی پریشدوں کا قیام عمل میں آیا ہے' جو ہندو اکثریت کا ذہن مسموم کرتی ہیں۔ فرقہ وارانہ آگ کو بھڑکایا جاتا ہے' رتھ یاتراؤں کا اہتمام کیا جاتا ہے' جن کے ذریعہ ہندو عوام میں فرقہ وارانہ ذہن کو پروان چڑھایا جاتا ہے۔ یہ اتنا بڑا فتنہ ہے جس نے بابری مسجد کو مندر میں تبدیل کرنے کی کامیابی حاصل کر کے پوری فضا کو مسموم بنا دیا ہے۔ حکومت ان حالات پر قابو پانے سے قاصر ہے۔ ہندوستان اور خصوصاً شمالی ہند فرقہ پرستی کی بھڑکائی ہوئی اس آگ سے جوالا مکھی بنا ہوا ہے۔ اگر یہ جوالا مکھی پھٹ گیا تو پورا ملک آتش فشاں بن جائے گا۔

پروگرام : اس غرض کی تکمیل کے لئے ذیل کا پروگرام طے کیا گیا ہے:

(۱) ایک کل ہند تاریخ اسلام کانفرنس (History of Islam Conference) منعقد کی جائے جس میں ہندوستان کے طول و عرض سے زیادہ سے زیادہ تعداد میں تاریخ کے مسلم اساتذہ' محققین اور مؤرخین' دانشوروں اور ریسرچ اسکالروں کو مدعو کیا جائے' یونیورسٹیوں اور کالجوں کے علاوہ دینی جامعات کے موزوں اساتذہ اور نمائندے اور علمی مراکز اور اکیڈیمیز وغیرہ کے تاریخ سے وابستہ اور دلچسپی رکھنے والے مسلمان اسکالروں کو بھی مدعو کیا جائے۔ اس کانفرنس میں ہندوستان میں اسلامی تاریخ کا مفصل جائزہ لیا جائے اور

ایک مکمل، مفصل اور تحقیقی تاریخِ اسلام مرتب کرنے کا تفصیلی خاکہ بھی منظور کیا جائے اور موزوں محققین اور مؤرخین اور پروفیسروں اور دانشوروں کا انتخاب بھی کیا جائے جو مناسب معاوضے پر مختلف ابواب مرتب کریں گے۔ اس کے علاوہ اس کانفرنس میں مسلم مؤرخین، دانشوروں اور اساتذہ کو ان کی ذمہ داریاں بھی یاد دلائی جائیں گی اور انہیں تاریخ نویسی کی اہمیت کے پیشِ نظر علمی اور مستقل تعاون پر آمادہ کیا جائے گا۔

(۲) ایک جائزہ کمیٹی مقرر کی جائے گی، جو اس کانفرنس کے انعقاد سے پہلے ہندوستان کی تمام ریاستوں اور مرکز کے زیرِ انتظام علاقوں میں حکومت کے منظور کردہ تاریخ کی کتابوں کا تفصیلی جائزہ لے گی۔ اُردو، ہندی اور انگریزی کے ساتھ ساتھ تمام صوبائی اور علاقائی زبانوں میں ہندوستانی تاریخ کے مسلمانوں سے متعلق ابواب کا تفصیلی جائزہ لیا جائے گا۔ جہاں جہاں غلط بیانی یا واقعات کی غلط تعبیر کی گئی ہے اس کی نشاندہی کر کے اس کے مقابل صحیح واقعات واضح کئے جائیں گے۔ اس طرح پرائمری کلاس سے ہائی اسکول تک کی منظور کردہ تمام زبانوں میں کورس کی کتابوں، خصوصاً تاریخ کی کتابوں میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں جو کچھ غلط فہمیاں پائی جائیں گی، اسے پورے حوالوں اور اس کی تصحیح کے ساتھ مرتب کر کے کتابی شکل میں شائع کیا جائے گا، جس سے ایک طرف محکمہ تعلیم کو بھی اندازہ ہو سکے کہ مسلمانوں کے ماضی و حال کے بارے میں بچوں کو کیا پڑھایا جا رہا ہے، اور خود مسلمانوں کو بھی معلوم ہو جائے کہ مدارس میں ان کے بچے کیا سیکھ رہے ہیں، نیز حکومت کے ذمہ داروں کو تصحیح کی طرف متوجہ کیا جا سکے۔

اس عظیم اسکیم کو روبہ عمل لانے اور عملی جامہ پہنانے کے لئے جو نظم قائم کیا گیا ہے، اس نے یہ طے کیا ہے کہ اس کو قانونی طور پر مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے کے لئے باقاعدہ سوسائٹیز ایکٹ کے تحت ایک سوسائٹی بنا کر رجسٹرڈ کرا لیا جائے۔ اس سوسائٹی کا میمورنڈم اور اس کے قواعد و ضوابط (Aims and Objects) ہم ذیل میں بہ زبان انگریزی بجنسہٖ درج کر رہے ہیں، اس سے اس کے قانونی پہلوؤں کا اندازہ ہو سکے گا۔ اس سوسائٹی کا نام The Academy of Indian Islamic History رکھا گیا ہے۔ ہم بڑی اُمنگوں سے پورے حزم و احتیاط کے ساتھ اس سوسائٹی کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کام کی توفیق عطا فرمائے اور اسے اپنی برکتوں سے نوازے، آمین۔

جدید دنیائے اسلام

قسط وار سلسلہ (16)

بنگلہ دیش

تحقیق و تحریر: سید قاسم محمود

بنگلہ دیش : ایک نظر میں

صدر: اعجاز الدین احمد (2002ء)
وزیر اعظم: خالدہ ضیاء (اکتوبر 2001ء)
رقبہ: ایک لاکھ 44 ہزار مربع کلومیٹر
آبادی: 14 کروڑ 42 لاکھ
شرح افزائش 2.08 فیصد
شرح پیدائش: 30.03 فیصد
شرح اموات اطفال: 8.52 فی ہزار
گنجانی آبادی: 2542 فی مربع میل
دارالحکومت: ڈھاکا (آبادی ایک کروڑ تقریباً)
کرنسی: ٹکہ۔ 100 پیسے
زبانیں: بنگلہ، انگریزی، اردو
نسلیں: بنگالی 98 فیصد، بہاری 3 لاکھ، قبائلی 20 لاکھ
مذہب: مسلمان 83 فیصد، ہندو 16 فیصد۔ باقی عیسائی اور دوسرے۔
شرح خواندگی: 43 فیصد
مجموعی قومی پیداوار: 258 ارب ڈالر
فی کس آمدنی: 1900 ڈالر سالانہ
شرح افزائش: 5.3 فیصد
افراطِ زر: 5.6 فیصد
قابل کاشت رقبہ: 62 فیصد
زراعت: چاول، پٹ سن، چائے، گندم، گنّا، آلو، تمباکو، دالیں، پولٹری
صنعت: سوتی کپڑا، پٹ سن، خوراک، فولاد، کھاد، نیوز پرنٹ کاغذ، سیمنٹ
وسائل: قدرتی گیس، عمارتی لکڑی، کوئلہ
برآمدات: 6.71 ارب ڈالر۔ سوتی کپڑا، پٹ سن اور اس کی مصنوعات، چمڑا، مچھلی، سمندری غذائیں۔
درآمدات: 9.49 ارب ڈالر۔ مشینری اور آلات، اشیائے صرف، کیمیکل، لوہا اور فولاد، پارچات، خوراک، پٹرول۔
تجارتی ساتھی: بھارت، امریکہ، جرمنی، چین، سنگاپور، برطانیہ، فرانس، جاپان، ہانگ کانگ

بنگلہ دیش

دنیائے اسلام میں سب سے زیادہ آبادی کے مالک، اس مسلم ملک میں مسلمانوں کی اکثریت کی متعدد وجوہات ہیں۔ اوّل، بیرونی ممالک سے مسلمانوں کی آمد۔ دوم، مسلمانوں کی نسل میں افزائش و ترقی اور سوم، مقامی باشندوں کا قبول اسلام۔

مختلف ادوار میں عرب، ایرانی، ترک اور حبشی مسلمان یہاں آ کر آباد ہوتے رہے۔ محمد بن بختیار خلجی کے حملے سے قبل بھی چاٹگام کے نواح میں عرب تاجروں کی آبادی کا سراغ ملتا ہے۔ پہاڑپور

اور میناتی کے علاقے سے ملنے والے سکّوں اور دیگر آثارِ قدیمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں مسلمان خلافت بنوعباسیہ کے عہد میں بھی آباد تھے۔ محمد بن بختیار خلجی کے زمانے میں بیرونی ممالک سے آنے والے مسلمانوں کی آبادی پندرہ بیس ہزار تھی' لیکن خلجیوں کے برسراقتدار آنے کے بعد مزید افغان' ترک اور ایرانی کثیر تعداد میں شمالی ہند سے یہاں پہنچے۔ ان میں صرف افغانوں کی تعداد دو لاکھ سے کم نہ تھی۔ خودمختار سلاطینِ بنگالہ کے دور میں ان کی آمد میں کمی واقع ہوگئی' لیکن مغلیہ عہد میں ایک بار پھر مسلمان' ہندوستان کے شمالی صوبوں' بلکہ ترکستان اور حبشہ جیسے دور دراز ممالک سے ملازمت وتجارت کی غرض سے' یہاں آ کر بسنے لگے۔ ایران میں صفوی حکومت کے زوال پر' خصوصاً بنگال میں نواب مرشد قلی خان کے زمانے میں ایرانیوں کی ایک بڑی تعداد یہاں آئی۔ ان میں تاجر بھی تھے' معلّم اور طبیب بھی تھے اور سپاہی پیشہ بھی۔ اس دوران میں لاکھوں مقامی باشندوں نے بھی اسلام قبول کیا۔ چنانچہ 1770ء میں ایک تہائی بنگالی مسلمانوں کے آباء واجداد بیرونی مسلمان تھے اور دو تہائی کے مقامی نومسلم۔

بنگال میں مسلمانوں کی آبادی بڑھنے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان کے ہاں کثرتِ ازدواج کا عام رواج رہا ہے اور ہندوؤں کے برعکس بیوہ یا مطلقہ عورت کی شادی پر کوئی پابندی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں ہندوؤں کی بہ نسبت شرح پیدائش بہت زیادہ رہی ہے۔ 1872ء میں یہاں مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں سے پچاس لاکھ کم تھی' لیکن 1891ء میں ان سے پندرہ لاکھ زیادہ ہوگئی۔ 1872ء میں مسلمانوں کی آبادی ایک کروڑ ساٹھ لاکھ تھی جو 1941ء میں تین کروڑ اسّی لاکھ ہوگئی۔ اس کے برعکس اس عرصے میں ہندوؤں کی آبادی ایک کروڑ ستر لاکھ سے صرف تین کروڑ بیس لاکھ ہوسکی۔ اس کا باعث مسلمانوں میں زیادہ شرح پیدائش اور ہندوؤں کا قبول اسلام ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔

بنگلہ دیش میں اشاعتِ اسلام میں سلاطین' علماء اور صوفیہ کا بڑا حصہ ہے۔ سلاطین نے حکومت قائم کر کے علماء کی سرپرستی اور صوفیہ کی اعانت کی۔ پھر انہوں نے مدارس قائم کیے' مسجدیں تعمیر کیں' خانقاہیں بنوائیں اور ایک خالص مسلم معاشرے کی بنیاد ڈالی۔ انہوں نے ملک میں امن وامان بحال کیا۔ زراعت اور تجارت کو ترقی دی۔ چیزیں ارزاں ہوئیں اور رعایا خوشحال۔ اس سے ایک طرف تو اُن کی حکومت کو استحکام ملا اور دوسری طرف وہ دین بھی رعایا میں مقبول ہوا جس کے وہ ماننے اور چاہنے والے تھے۔ سلاطین اور ان کے مسلمان امراء کا سلوک ہندوؤں اور بدھوں سے بڑا روادارانہ تھا اور ان سے ساری رعایا بلا امتیاز مذہب وملّت فیض یاب ہوتی تھی۔ ان کے درباروں میں غیر مسلم اعلیٰ مناصب پر فائز ہوتے اور مسلمانوں کی زندگی اور اعلیٰ کردار سے متاثر ہوتے تھے۔

علماء نے نہ صرف سلاطین کو وقتاً فوقتاً اسلامی اصولوں پر اپنی حکومت قائم کرنے کی تلقین کی' بلکہ اشاعتِ علم ودین کے لئے متعدد مدرسے قائم کیے اور لوگوں کو فارسی اور بنگلہ میں دینی ودنیوی تعلیم

دی۔قرآن وسنّت کی تعلیم وتدریس کے باعث عربی زبان بھی بنگالیوں کی بول چال کا جزو بن گئی۔ علماء نے برہمنوں کے ساتھ مذہبی مناظرے کیے' اور اکثر ایسا ہوا کہ علماء سے شکست کھانے کے بعد ان برہمنوں نے اپنے اہل خاندان اور عقیدت مندوں سمیت اسلام قبول کرلیا۔

اشاعتِ دین میں صوفیہ علمائے کرام سے بھی سبقت لے گئے۔انہوں نے اپنے حسن سلوک اور حسنِ اخلاق سے لوگوں کو اپنا اس طرح گرویدہ بنالیا کہ وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوگئے۔انہوں نے ہندو اور بدھ عوام سے براہِ راست رابطہ قائم کیا اور جگہ جگہ' حتیٰ کہ پہاڑوں اور جنگلوں میں بھی اپنی خانقاہیں قائم کیں۔علاوہ ازیں ان میں سے بعض بزرگ خدارسیدہ اور صاحبِ کرامت تھے۔ان کے آستانے سے عوام لاکھوں کی تعداد میں فیض حاصل کرتے تھے۔

یہ سچ ہے کہ ہندوؤں نے اپنے دھرم کو بچانے کے لئے اسلام کا سخت مقابلہ کیا' لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ برہمن اور کالیتھ پنڈت اسلامی معاشرے اور دین اسلام کی خوبیوں کو اپنی مذہبی تعلیم اور اعلیٰ ذہنی صلاحیت کے باعث دوسروں کی بہ نسبت زیادہ سمجھتے اور اس سے متاثر ہوسکتے تھے۔''امرت کنڈ'' میں لکھا ہے کہ ایک بھوجار پنڈت نے قاضی رکن الدین سمرقندی سے فلسفے پر بحث کی اور قائل ہو کر مسلمان ہوگیا۔راجا کنس کے بیٹے جدو نے اسلام قبول کیا اور جلال الدین کے نام سے بنگال پر حکومت کی۔افغانوں کے دورِ حکومت کا مشہور سپہ سالار ''کالا پہاڑ'' کالیتھ تھا اور مسلمان ہوگیا تھا۔ ایک اور مسلمان سپہ سالار عیسیٰ خان کا باپ ایک نومسلم راجپوت تھا۔باگر ہاٹ کا وزیر محمود ظاہر برہمن خاندان سے تھا۔اسلام خان سوری کے زمانے میں پٹنہ کے زمیندار رکھورائے نے اسلام قبول کیا۔ بہت سے برہمن اور کالیتھ مسلمان حکمرانوں سے میل جول رکھنے کی وجہ سے ذات سے خارج کردیئے جاتے تھے۔اس ذلت اور توہین سے بچنے کے لئے وہ اکثر اپنے خاندان سمیت مسلمان ہو جاتے تھے۔سینگھٹیا کے برہمن زمینداروں کو برادری سے نکالا گیا تو انہوں نے اسلام قبول کرلیا۔ان امور کے پیش نظر یہ کہنا غلط ہوگا کہ اونچے طبقے کے ہندوؤں نے بنگال میں اسلام قبول نہیں کیا۔

مسلمان سلاطین کی رواداری' رعیت پروری اور علماء وصوفیہ کی دین داری اور پاکیزہ اخلاق و اطوار اور اس کے علاوہ اشاعتِ اسلام کا حلقہ وسیع ہونے کا سب سے بڑا سبب خود اسلام کی اعلیٰ تعلیمات اور اسلامی معاشرے کی یہ خوبی تھی کہ اس میں شامل ہو کر محمود و ایاز ایک ہو جاتے تھے۔ ہندوؤں میں ذات پات کا جو نظام قائم تھا' اس نے نیچی ذات کے ہندوؤں پر عرصۂ حیات تنگ اور ترقی کی تمام راہیں مسدود کر رکھی تھیں۔قبول اسلام سے انہیں معاشرتی مساوات اور ترقی کے دروازے کھلتے نظر آئے تو وہ جوق در جوق دائرہ اسلام میں داخل ہوتے چلے گئے۔مشرقی بنگال کے تانترک ہندو اس سلسلے میں بالخصوص قابل ذکر ہیں۔اسی طرح بدھ مت کے پیرو' سین راجاؤں کے عہد سے ظلم وستم کا نشانہ بنتے چلے آرہے تھے' انہیں بھی اپنی نجات کی صورت قبولِ اسلام ہی میں نظر آئی

اور یوں بنگال میں دین اسلام کی اشاعت کا دائرہ پھیلتا گیا۔

اسلام کا اثر بنگالی تمدن پر

بیرونی ممالک سے جو مسلمان بنگال آئے' وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ انہوں نے نومسلموں کے ساتھ ازدواجی تعلقات استوار کئے اور اس طرح بنگالی مسلمانوں کی جو نئی نسل پیدا ہوئی اس کی معاشرت اسلامی اقدار کے مطابق ڈھل گئی۔ اگرچہ بعض مقامی رسوم و رواج کی پابندی بدستور جاری رہی' تاہم عقائد کے اعتبار سے یہ لوگ بیرونی مسلمانوں سے بھی زیادہ کٹر تھے۔ وہ اپنے تمام معاملات میں قرآن و حدیث کی پابندی پر زور دیتے اور سولہویں صدی کے ایک ہندو شاعر وجے گپت کے بیان کے مطابق ہر مسئلے پر سیّد' ملّا اور قاضی سے ہدایت حاصل کرتے تھے۔ صوفیہ' علماء اور مبلغین دین نے نہ صرف اصولِ اسلام کی تلقین کی' بلکہ اپنے مدرسوں اور خانقاہوں میں ان کے مطابق زندگی بسر کرنے کا طریقہ عملی طور پر پیش کیا۔ اس سلسلے میں حکومت کی اعانت بھی شاملِ حال رہی' جس کی طرف سے قوانینِ شریعت کے نفاذ کی بدولت سب مسلمان ایک مشترکہ ثقافتی' اخلاقی اور آئینی سانچے میں ڈھل گئے۔

دورِ اوّل کے صوفیہ کرام' ملّا شیخ جلال الدین تبریزی (وفات 1225ء)' شیخ جلال بحر یمنی سلہٹی (و1347ء)' شیخ سراج الدین (و1325ء)' مولانا عطا دیناج پوری (و1350ء)' شیخ علاء الحق (و1398ء)' اور حضرت نور قطبِ عالم (و1410ء) وغیرہ انتہائی راسخ العقیدہ' پابندِ شریعت اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ ان کی خانقاہیں' نیز سنارگاؤں' پنڈوہ' گوڑ' چاٹگاؤں اور دیناج پور میں ممتاز علماء کے مدارس دینِ حق کی توسیع و اشاعت کے بڑے مراکز تھے' جن کی بدولت نومسلموں کی زندگی اور ان کے اخلاق و اطوار میں ایسا انقلاب رونما ہوا' جس کی کٹر سے کٹر ہندو بھی تعریف و توصیف کئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ چنانچہ ایک ہندو مصنف مکندرام چکرورتی نے لکھا ہے کہ ایک عام بنگالی مسلمان کی زندگی میں ایمان و تقویٰ بدرجۂ اتم نظر آتا ہے۔

ہندوؤں نے اسلام کی روز افزوں توسیع و اشاعت کو روکنے کے لئے مختلف تحریکیں شروع کیں۔ ''سمرتی شاستر'' کی تجدید کی کوششیں تو محض مغربی بنگال کے برہمنوں تک محدود رہیں' لیکن وشنومت اور بھکتی تحریکیں خاصی مقبول ہوئیں۔ ان تحریکوں کے ذریعے ہندو معاشرے میں اسلامی اصول رائج کرنے کی کوشش کی گئی' مثلاً مساوات' سادگی اور توحید الٰہی۔ شری چیتنیہ کا نام اس سلسلے میں سرفہرست نظر آتا ہے۔ اس کا عقیدہ بڑی حد تک نظریۂ وحدت الوجود سے ملتا جلتا ہے۔ فرق یہ تھا کہ مؤخر الذکر نظریے میں تمام مخلوق کو صفاتِ الٰہی کا پرتو سمجھا جاتا ہے اور اس عقیدے کی رو سے ہر شے ذاتِ الٰہی کی مظہر ہے' لیکن عوام نے عموماً اس امتیاز کو سمجھنے کی کوشش نہ کی اور رفتہ رفتہ اس تحریک

کے اثرات مسلمانوں میں بھی پھیلنے لگے۔ بظاہر ان تحریکوں کا مقصد یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترکہ مذہبی عقائد کو اجاگر کر کے دونوں قوموں میں اتحاد و اتفاق پیدا کیا جائے' لیکن درحقیقت اس سے ایک طرف تو ہندو معاشرے کی اصلاح مقصود تھی' تاکہ عام ہندو اپنی معاشرتی خرابیوں کے باعث اسلام کی طرف راغب نہ ہوں' اور دوسری طرف اپنے مذہبی عقائد کو مسلمانوں کے اندر رائج کرنا مطلوب تھا۔

سولہویں صدی میں سری نواس اچاریہ (1522ء تا 1608ء)' نروتم ٹھاکر (1531ء تا 1631ء)' اور شیاما نند (1535ء تا 1630ء) کے نظریات سے بنگال میں مروّجہ اسلامی تصوف بے حد متاثر ہوا۔ چنانچہ ایک نیا فرقہ بوگی قلندروں کا وجود میں آیا' جس کے عقائد میں بھکتی' یوگا اور مسلمان قلندروں کے نظریات شامل تھے۔ داراشکوہ کی ''مجمع البحرین'' اسی تحریک کی مظہر ہے۔

اٹھارہویں صدی کے اخیر میں اخلاقی زوال اور مذہبی انحطاط نے ستیہ پیر جیسے فرقے پیدا کر دیئے' جن کے عقائد دین اسلام کے سراسر خلاف اور اطوار انتہائی کج روی کے حامل تھے۔

عہد مغلیہ میں راسخ العقیدگی کو خاصا ضعف پہنچا۔ اعلیٰ طبقے کی طرزِ زندگی کا اثر عوام پر بھی پڑا اور ہندو مسلمان ایک دوسرے کے عقائد و رسوم کو اپنانے لگے۔ بہرکیف اس سے ایک مشترکہ ہندو مسلم ثقافت ہرگز پیدا نہ ہو سکی' لیکن قوانینِ شریعت کے نفاذ' جگہ جگہ دینی مدارس اور خانقاہوں کے وجود اور علماء و شیوخ کے اثر و نفوذ کے باعث عام مسلمان اپنے عقائد سے روگرداں نہ ہو سکے اور ستیہ پیروں' فقیروں اور جوگیوں کا حلقہ بہت محدود رہا۔ اس ضمن میں شیخ احمد سرہندیؒ کی مساعی نے بھی بڑا کام کیا۔ انہوں نے اپنے ایک خلیفہ مولانا حمید دانشمند کو بردوان بھیجا' جہاں ان کا جاری کیا ہوا مدرسہ اصلاحِ عقائد اور تجدید دین کا مرکز بن گیا۔ شاہ عبدالرحیم (متوفی 1745ء) اور سید محمد دائم عظیم پوری (متوفی 1791ء) نے ڈھاکہ میں' اور دوسرے بزرگوں نے بنگال کے مختلف حصوں میں یہ اہم کام جاری رکھا۔ انگریزوں کی حکومت کے قیام کے بعد سید احمد شہیدؒ کی تحریک سے سرزمین بنگال بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ ان کے خلیفہ مولانا کرامت علی اور ان کے جانشینوں نے شمالی اور مغربی بنگال میں مسلمانوں کی بیش قرار خدمات سرانجام دیں۔ اسی طرح فرائضی تحریک نے بھی انہیں دینی اور سیاسی اعتبار سے بیدار رکھنے میں کچھ کم حصہ نہیں لیا۔

(یہاں تک بنگلہ دیش میں اسلام کی توسیع و اشاعت کا مختصراً ذکر ہوا۔ آئندہ شمارے میں بنگالی مسلمانوں کی سیاسی تاریخ کا ورق کھلے گا)